بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی

تعارف

اجے کمار گھوش

بھگت سنگھ
اور اس کے ساتھی

مکتبۂ دانیال
کراچی

جملہ حقوق محفوظ

پہلی بار : ۱۹۷۴ء

دوسری بار : ۱۹۸۰ء

تیسری بار : ۱۹۸۱ء

چوتھی بار : ۱۹۸۵ء

قیمت : ۶ روپے

ناشر : حوری نورانی، مکتبۂ دانیال

وکٹوریہ چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر
کراچی

طابع : احمد برادرز — کراچی

پیش لفظ

کھول کے کیا بیاں کروں سرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ، حیاتِ بے شرف — اقبال

یہ اُن شیر دل شہیدوں کی داستان ہے جنھوں نے آزادی اور سوشلزم کے پرچم کو اپنے خون سے سُرخ رُو کیا۔ یہ اُن شیدائیانِ حق کا تذکرہ ہے جو آج سے چالیس پینتالیس سال پیشتر تشدد کی پُرخار راہوں سے گذر کر کمیونزم کی منزل تک پہونچے تھے۔ خطر پسندی ان کے قدم چومتی تھی اور خوف و ہراس ان کے سائے سے بھی گریز کرتا تھا۔ ان جوانمردوں نے اپنی جراٴت و استقامت سے ہر جبر کو اختیار میں بدل دیا۔ اپنی قربانیوں سے ہمارے قومی وجود کو نیا شعور عطا کیا اور اپنے سوزِ یقین سے لاکھوں محبانِ وطن کے سینے روشن کیے۔ انقلابیوں کے اس چھوٹے سے قافلے کا رہبر سردار بھگت سنگھ تھا اور جس شخص نے اپنے شہید سردار کی روایت کو نئی سطح پر زندہ کیا اس کا نام اجے کمار گھوش تھا۔

سردار بھگت سنگھ کو میں نے کبھی نہیں دیکھا البتہ اجے کمار گھوش سے میری پہلی ملاقات دسمبر ۱۹۳۵ء میں ہوئی تھی۔ میں بڑے دن کی چھٹیوں میں علی گڑھ سے وطن جا رہا تھا کہ ڈاکٹر اشرف مرحوم نے کہا کہ کانپور تمہارے راستے میں پڑتا ہے۔ یہ پیکٹ اور روپے وہاں اجے کمار گھوش

کے حوالے کردیا۔یہ وہ زمانہ تھا کہ دہشت پسندوں کی تحریک دم توڑ چکی تھی۔ اجے کمار گھوش کیمونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ مزدور سبھا میں کام کرتے تھے اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہتے تھے جو گنیش مل میں ملازم تھے۔

ریل گاڑی جب وقت کانپور پہونچی تو رات کے چار بج رہے تھے۔ میں نے سامان ویٹنگ روم میں رکھا اور تانگے میں بیٹھ کر گنیش مل روانہ ہو گیا۔ اجے کمار کے بھائی مل سے ملے ہوئے ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتے تھے اس لئے مجھے گھر تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ہمارا تانگہ جونہی بنگلے کے سامنے رکا تو برآمدے میں روشنی ہو گئی اور کسی نے فوراً ہی پھاٹک کھول دیا۔ اجے کمار کو شاید میرے آنے کی اطلاع پہلے سے تھی۔ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ پہلے ڈاکٹر اشرف کی خیریت پوچھی پھر مسلم یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ کے سیاسی رجحانات کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ اتنے میں چائے آگئی۔ چائے پیتے پیتے وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگے تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ مجھے پرکھ رہے ہوں۔ اب وہ مجھ سے میرے حالات دریافت کر رہے تھے۔ کہاں کے رہنے والے ہو۔ زمینداری کتنی ہے۔ کیا پڑھتے ہو۔ تعلیم سے فارغ ہو کر کیا کرو گے۔ یہ گفتگو جاری تھی کہ کہیں دور سے اذان کی آواز آئی۔ انھوں نے گھڑی دیکھی اور کہنے لگے کہ صبح ہو رہی ہے۔ اب تم جاؤ۔ میں چلا آیا۔

جن دنوں میں کرسچین کالج الہ آباد میں پڑھتا تھا تو اخباروں میں لاہور سازش کیس کی رُوداد روز چھپتی تھی لیکن مجھ میں سیاسی سوجھ بوجھ اتنی کم تھی کہ دہشت پسندوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا کبھی خیال نہ آیا۔ پھر اُن کی بھوک ہڑتال کے چرچے ہونے لگے اور ایک دن خبر آئی کہ جتین داس ۶۳ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد وفات پا گئے۔ یہ خبر سارے شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ طلباء نے کلاسوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ دکانیں بند ہو گئیں۔ دفتروں کے بابو سڑکوں پر نکل آئے۔ ساری فضا جتین داس زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی۔ چار آدمی اکٹھا ہوتے۔ بھوک ہڑتال کا تذکرہ چھڑ جاتا۔

ہر شخص انگریزوں کو بُرا بھلا کہتا اور جوانمرگ جتین داس کی موت پر افسوس کرتا۔ حالانکہ کسی نے نہ تو جتین داس کو دیکھا تھا اور نہ لوگوں کو اُس کے دہشت پسندانہ خیالات سے ہمدردی تھی۔ وہ تو بس اتنا جانتے تھے کہ ایک نوجوان انگریزوں کی قید میں جان سے گیا ہے۔

اَجے کمار گھوش سے میں دوسری بار نو سال بعد بمبئی میں ملا۔ اس اثنا میں وہ کئی بار قید ہوئے اور چھوٹے۔ پھر پتہ چلا کہ اُن کو جیل ہی میں دِق ہوگئی ہے اور اب وہ بھینی تال سینی ٹوریم میں ہیں۔ وہاں سے نکلے تو کچھ دن کشمیر میں قیام کرنے کے بعد لاہور چلے گئے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور پولٹ بیورو کے رُکن تھے اس لئے پنجاب کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم اُن کے سپرد ہوئی۔ تقریباً ایک سال لاہور میں رہنے کے بعد وہ مستقل طور پر بمبئی چلے آئے۔ ڈاکٹروں نے دوڑ دھوپ کرنے کی سخت ممانعت کر رکھی تھی۔ لہٰذا ان کا زیادہ وقت دفتر ہی میں گذرتا تھا۔ وہ رہتے بھی وہیں تھے۔ اس لئے ان سے دِن میں کئی کئی بار ملاقات ہو جاتی تھی۔

اَجے کمار گھوش کا قد چھ فیٹ سے بھی اونچا تھا۔ چوڑی چوڑی ہڈیاں، کھلاڑیوں کا سا گٹھا ہوا بدن، چوڑا ماتھا گھنی گھنی بھوؤں کے نیچے سے جھانکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی مگر نہایت چمکیلی آنکھیں، پتلے پتلے اور بھنچے ہوئے ہونٹ جن کو دیکھ کر انجان آدمی کو تند خوئی یا بد مزاجی کا دھوکا ہونے لگے۔ ان کی رنگت اور جسم کی بناوٹ ایسی تھی کہ اکثر یہی گمان ہوتا تھا کہ یہ شخص ہماری طرح گوشت پوست سے نہیں بنا ہے بلکہ لوہے یا سیسے میں ڈھلا ہے۔ اجے کمار گھوش ہر لحاظ سے کمیونسٹ پارٹی کے مردِ آہن تھے البتہ اُن کا دِل موم سے بھی زیادہ نرم تھا۔ کسی کو اُداس دیکھتے تو اپنے کمرے میں لیجاتے۔ بجھاتے بجھاتے۔ دلجوئی کی باتیں کرتے اور اپنے تلخ ذاتی تجربوں کا ذکر کر کے اس کا حوصلہ بڑھاتے۔ کوئی بیمار پڑتا تو اس کی تیمارداری نرسوں کی طرح کرتے تھے وہ طبیعاً بہت کم سخن واقع ہوئے تھے البتہ کوئی مسئلہ چھڑ جاتا تو گھنٹوں بولتے اور بالکل نہ تھکتے۔

دہشت پسندوں کے بارے میں انگریزوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ بڑے ظالم اور خونخوار ہوتے ہیں۔ قتل و غارت گری اور لوٹ مار ان کا شیوہ ہے اور وہ جنسی اخلاق سے

امکل خالی ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان تہمتوں کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ کمیونسٹ پارٹی میں ایسے درجنوں اشخاص تھے جو کسی زمانے میں دہشت پسند رہ چکے تھے مگر وہ سب کے سب نہایت نیک، نرم دل اور پاکباطن لوگ تھے۔ مثلاً پی۔ سی۔ جوشی کی بیوی کلپنا دت تھیں جنھوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسے میں گورنر پر گولی چلائی تھی اور پھانسی کی سزا پائی تھی جو بعد میں عمر قید میں بدل دی گئی تھی۔ وہ سولہ۔۔ن کے بعد رہا ہوئی تھیں۔ بہت دھیمی آواز اور نرم لہجے میں بولتیں اور ہر وقت مسکراتی رہتیں۔ اور جب کوئی پوچھتا آپ دیکھنے میں تو بالکل فاختہ لگتی ہیں، پھر آپ نے پستول کیسے چلایا تو وہ جواب دیتیں کہ انقلابی گولی ہاتھ سے نہیں دل سے چلائی جاتی ہے۔ جہاں تک بدچلنی کا تعلق ہے اجے گھوش بتاتے تھے کہ دہشت پسندوں کے ضابطے اتنے سخت تھے کہ جنسی بے راہ روی کی پاداش میں گولی ماردی جاتی تھی۔

میں کرسچین کالج ہی میں تھا کہ ایک دن خبر آئی کہ ہالینڈ ہال میں جو یونیورسٹی کا ہاسٹل تھا ایم اے اور لا کے ایک طالب علم پورن چندر جوشی کو کمیونسٹ ہونے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ (کمیونسٹوں کی یہ ملک گیر گرفتاری میرٹھ سازش کیس کی تمہید تھی) ہالینڈ ہال اُن دنوں انقلابی نوجوانوں کا گڑھ بن گیا تھا۔ اس کے وارڈن مسٹر جارڈین تھے تو انگریز مگر آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے اور عیسائیوں کی تبلیغی جماعت سے وابستہ ہونے کے باوجود (یا باعث) نہایت روشن خیال اور آزاد منش انسان تھے۔ وہ شہر کے انگریز افسروں سے دور رہتے تھے اور انگریزی حکومت کے طور طریقوں کو سخت ناپسند کرتے تھے ان کی وجہ سے ہالینڈ ہال میں دوسرے ہوسٹلوں کی بہ نسبت زیادہ آزادی تھی۔ بورڈنگ ہاؤس کے طالب علموں میں اکثریت گڑھوالیوں اور بنگالیوں کی تھی جن میں فرقہ وارانہ تعصب نام کو بھی نہیں تھا۔ یونیورسٹی میں داخل ہو کر میں نے بھی وہیں اقامت اختیار کر لی تھی۔

ایک دن سہ پہر کے وقت میں مسلم بورڈنگ ہاؤس میں دوستوں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ دفعتاً گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ پورے بورڈنگ میں تہلکہ مچ گیا اور سب

لوگ پھاٹک کے باہر نکل آئے۔ سامان لگا کر سنا تو اندازہ ہوا کہ فائرنگ کی آواز الفریڈ پارک کی سمت سے آ رہی ہے۔ یہ پارک مسلم بورڈنگ ہاؤس سے بالکل ملحق تھا۔ بیچ میں فقط ایک سڑک تھی۔ فائرنگ دس پندرہ منٹ میں بند ہو گئی لیکن ہم میں سے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ پارک میں جا کر صورت ماجرہ کا پتہ لگاتا۔ دوسرے دن اخباروں سے معلوم ہوا کہ مشہور دہشت پسند چندر شیکھر آزاد پولیس سے مقابلہ کرتا مارا گیا ہے۔ وہ کلکتہ سے لاہور جاتے ہوئے ایک دن کے لئے الٰہ آباد میں رُکا تھا۔ دہشت پسندوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی خفیہ ملاقاتیں کسی باغ، پارک، سینما گھر یا ہسپتال میں کرتے تھے۔ چندر شیکھر آزاد نے اسی بنا پر الفریڈ پارک کو منتخب کیا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ لوگ ہوا خوری کے لئے آ جا رہے تھے۔ کوئی بنچ پر بیٹھا مسواک کر رہا تھا۔ کوئی ورزش میں مصروف تھا اور پولس کے فرشتوں کو بھی یہ خیال نہیں گذر سکتا تھا کہ وہ شخص جس کے سر پر ہزاروں روپے کا انعام مقرر ہے ایک بنچ پر بیٹھا دوستوں سے گفتگو کر رہا ہوگا۔ جب دوپہر ہو گئی تو آزاد کا ایک ساتھی بولا کہ بھوک لگ رہی ہو گی۔ اگر آپ کہیں تو میں بازار سے کچھ کھانے کے لئے لے آؤں۔ چندر شیکھر نے کہا کہ لے آؤ لیکن ذرا دیکھ بھال کر۔ وہ چلا گیا مگر بازار جانے کے بجائے تھانے! اور تھوڑی دیر کے بعد پارک میں سادہ پوشاک سپاہیوں کی آمد شروع ہو گئی۔ چندر شیکھر فوراً بھانپ گیا کہ اب ہم پولیس کے نرغے میں ہیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم دونوں بھاگنے کی کوشش کرو۔ البتہ میرے لئے اب یہاں سے فرار ممکن نہیں ہے۔ وہ دونوں چپکے سے اُٹھے اور ٹہلتے ہوئے پارک کے کنارے تک آئے وہاں ایک چھوٹی سی پلیا تھی۔ وہ اس میں گھس گئے اور سڑک پر نکل آئے۔ وہاں انھوں نے دو سائیکل سواروں کو پستول دکھا کر نیچے اتارا۔ سائیکلوں پر بیٹھے اور یہ جا وہ جا۔ تب چندر شیکھر بنچ پر سے اُٹھا اور ایک تناور درخت کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا جو قدرے اونچائی پر تھا۔ اب دشمن کے سپاہی نشیب میں تھے۔ فائرنگ شروع ہو گئی۔ مگر ایک آدمی درجنوں مسلح سپاہیوں کا مقابلہ کب تک کرتا۔ کہتے ہیں جب پستول میں آخری

گولی رہ گئی تو چندر شیکھر نے اس سے اپنا کام تمام کر لیا۔

دوسرے دن وہ درخت جس کے نیچے چندر شیکھر نے جان دی تھی محبانِ وطن کی زیارت گاہ بن گیا۔ وہاں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا۔ کوئی درخت کو چومتا کوئی خون کے دھبوں پر پھول چڑھاتا۔ عورتیں آنسو بہاتیں اور درخت کے تنے پر سیندور کے ٹیکے لگاتیں۔ چندر شیکھر مر کر لوگوں کے دلوں میں دوبارہ زندہ ہو گیا تھا۔ لیکن سرکار کو اس کی یہ مقبولیت گوارا نہ تھی چنانچہ ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ درخت کو راتوں رات جڑ سے کاٹ دیا گیا۔ دوسرے دن جب لوگ حسبِ معمول زیارت کے لئے پہونچے تو درخت غائب تھا اور اس کی جگہ گھاس اُگی ہوئی تھی۔ البتہ وہ درخت سلامت رہا جس کے پیچھے سے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے چھپ کر گولی چلائی تھی۔ اس درخت کو دیکھ کر چندر شیکھر کی قادر اندازی کا قائل ہونا پڑتا تھا۔ اس کی سب گولیاں چھ انچ کے دائرے ہی میں پیوست ہوئی تھیں۔

لاہور بھی عجیب و غریب شہر ہے۔ اگر ایک طرف یہ شہر ہماری تہذیب اور علم و ادب کا عظیم مرکز رہا ہے تو دوسری طرف اربابِ اختیار کی بیشتر ریشہ دوانیوں اور سازشوں نے اسی شہر میں بار پایا ہے۔ اگر ایک طرف یہ مقام دولتِ انگلشیہ کے ازلی نمک خواروں کا مسکن رہا ہے تو دوسری طرف ہماری جنگ آزادی کی بیشتر داستانیں بھی اسی مقدس سرزمین سے وابستہ ہیں۔ تاج برطانیہ کے خلاف سازش کا مقدمہ ۱۹۱۵ء اسی شہر میں چلا تھا اور سردار کرتار سنگھ کو پھانسی دی گئی تھی اور بابا سوہن سنگھ بھکنہ، بابا ویساکھا سنگھ اور پرتھوی سنگھ آزاد نے جو غدر پارٹی کے رہنما تھے (پھر کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے تھے) عمر قید کی سزا پائی تھی۔ پھر ۱۹۲۸ء میں اسی شہر میں سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سانڈرس کی پولیس نے لالہ لاجپت رائے پر لاٹھیاں برسائی تھیں اور چند ہفتے بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور بھگت سنگھ نے سانڈرس کو اس کے دفتر کے سامنے گولی ماری تھی اور ۱۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو بھگت سنگھ، راج گورو اور سکھ دیو نے

لاہور سنٹرل جیل میں جامِ شہادت پیا تھا۔

لاہور سنٹرل جیل ایوب خاں سے پہلے وہاں تھا جہاں اب شادمان کالونی آباد ہے۔ سینکڑوں ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا یہ قید خانہ بجائے خود ایک شہر تھا جسے انگریزوں نے ۱۹ویں صدی میں بسایا تھا۔ اس کی چار دیواری کے اندر عام قیدیوں کی بارکوں کے علاوہ چھوٹے بڑے آدھی درجن بنگلے بنے تھے۔ کوئی گورا وارڈ کہلاتا تھا کیونکہ اس میں انگریز قیدی رکھے جاتے تھے۔ کوئی شاہی وارڈ جس میں والیانِ ریاست یا اُمراء رہتے تھے۔ پھر دیوانی گھر تھا جو مقروض دولت مندوں کی قیام گاہ تھی۔ اور ان سب سے الگ بم کیس وارڈ تھا جو بھگت سنگھ اور لاہور سازش کیس کے دوسرے ملزموں کے لئے خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ میں نے بم کیس وارڈ ۱۹۵۱ء میں دیکھا تھا لیکن اس میں رہنے کی سعادت ۱۹۵۵ء میں اس وقت نصیب ہوئی جب محمد علی بوگرا نے امریکہ کی ہدایت پر کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا اور کمیونسٹوں کو گرفتار کر لیا حالانکہ مجھے رہا ہوئے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے تھے۔ جسٹس عابدی نے ملتان جیل میں ایک شعر کہا تھا کہ ؂

کچھ عجب بوئے نفس آتی ہے دیواروں سے
ہائے زنداں میں بھی کیا لوگ تھے ہم سے پہلے

یہ شعر لاہور سنٹرل جیل پر ملتان جیل سے کہیں زیادہ صادق آتا ہے کیونکہ برصغیر کا شاید ہی کوئی ممتاز سیاسی رہنما ہو جس نے لاہور جیل کی ہوا نہ کھائی ہو۔

لاہور جیل کے دوسرے تمام وارڈوں کی چار دیواریاں پکی مٹی کی تھیں۔ البتہ بم وارڈ کی چار دیواری پکی اینٹوں کی تھی۔ اندر تقریباً دو ایکڑ کا احاطہ تھا جس کے مغربی سمت میں پندرہ سولہ سیل ایک قطار میں بنے تھے۔ سیلوں کی لمبائی دس بارہ فیٹ اور چوڑائی سات آٹھ فیٹ ہوگی۔ سیل کے دروازے لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں کے تھے۔ دروازے کے آگے ایک چھوٹا سا سائبان تھا۔ سائبان کیا لوہے کا پنجرہ تھا جس کی دیواریں

اور چھتیں سب آہنی سلاخوں کی تھیں۔ جیسے چڑیا گھر میں شیروں اور چیتوں کے سیل ہوتے ہیں۔ تبھی تو رات کے وقت جب ہم بستر پر لیٹتے تھے تو کسی نہ کسی سیل سے ضرور آواز آتی تھی کہ توفیق کس حال میں ہے اور جواب ملتا تھا کہ شیر وہ ہے کہ جال میں ہے۔

ہم لوگ یہ تو جانتے تھے کہ یہ وارڈ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے لیے بنایا گیا تھا مگر جی بہت چاہتا تھا کہ کوئی عینی شاہد مل جائے تو اس سے ان لوگوں کے بارے میں کچھ تفصیلات معلوم کی جائیں۔ ایک روز ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آئے تو باتوں باتوں میں لاہور سازش کیس کا تذکرہ چھڑ گیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ وارڈ نیا نیا تعمیر ہوا تھا اور اسی جیل میں تعینات تھا۔ پھر تو ہر طرف سے سوالوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔ وہ بولے بھگت سنگھ وغیرہ کو وہ تمام سہولتیں میسر تھیں جو آپ لوگوں کو ہیں۔ البتہ شب کو ان کو سیلوں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ انھیں سیل کی روشنی بجھانے کی اجازت نہ تھی اور نہ وہ مسلسل دو راتیں ایک سیل میں بسر کر سکتے تھے بلکہ ان کو ہر روز ایک سیل سے دوسرے سیل میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ احاطے کے اندر اور باہر ساری رات مسلح پہرہ رہتا۔ پھر ڈپٹی صاحب نے پھانسی کے واقعات بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پھانسی کی سزا کے بعد قیدیوں کا وزن گھٹنے لگتا ہے اور دو چار ہفتوں ہی میں وہ اتنے لاغر ہو جاتے ہیں کہ کسی سہارے کے بغیر چل بھی نہیں سکتے (ہمارا مشاہدہ بھی یہی ہے) لیکن عجیب بات ہے کہ بھگت سنگھ کا وزن موت کی سزا سننے کے بعد برابر بڑھتا گیا۔ قریب قریب یہی حال راج گرو اور سکھ دیو کا تھا۔ وہ لوگ نہ تو کبھی اداس ہوئے اور نہ ان کے معمولات میں کوئی فرق آیا۔ پھانسی کے دن کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ لاہور میں فساد کا اندیشہ تھا اس لیے حکام نے طے کیا کہ بھگت سنگھ اور ان کے دونوں ساتھیوں کو رات کے وقت چپکے سے فیروز پور جیل منتقل کر دیا جائے، وہیں پھانسی دی جائے اور صبح ہونے سے پہلے لاشوں کو دریائے راوی کے کنارے جلا دیا جائے مگر بھگت سنگھ کے آدمیوں کو اس سازش کی خبر ہو گئی اور انھوں نے منصوبہ بنایا

کو پولیس کی گاڑی پر راستے میں حملہ کر کے قیدیوں کو چھڑا لیا جائے۔ حکام کو جب اس منصوبے کی اطلاع ملی تو قیدیوں کو فیروزپور لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔ اور یہ فیصلہ ہوا کہ پھانسی ہمیں لاہور جیل میں دی جائے۔ اب مشکل یہ تھی کہ قانوناً سپرنٹنڈنٹ جیل کی تحریری اجازت اور موجودگی کے بغیر کسی کو پھانسی نہیں دی جا سکتی لیکن سپرنٹنڈنٹ جیل رفاہ ڈاکٹر سوندھی تھے اور پروانۂ موت پر دستخط کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ لہٰذا ڈاکٹر سوندھی کو برطرف کر دیا گیا اور ان کی جگہ ایک خان بہادر صاحب سپرنٹنڈنٹ ہوئے۔ بھگت سنگھ راج گورو اور سکھ دیو کو پھانسی انھیں کی نگرانی میں دی گئی۔ مگر دہشت کا یہ عالم تھا کہ سرکار ان کی لاشوں سے بھی ڈرتی تھی۔ چنانچہ پولیس کی گاڑی پھانسی احاطے میں لائی گئی۔ لاشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے۔ ان ٹکڑوں کو بھوسے کی بوریوں میں بھرا گیا۔ بوریوں کو فیروزپور لے جا کر چتا میں جلایا گیا اور راکھ دریا میں بہا دی گئی۔ نہ کہیں جنازہ اٹھا اور نہ کہیں مزار بنا۔ مگر شہادت کی معراج تو یہی ہے۔

اجے کمار گھوش نے اس رسالے میں جہاں اپنے پرانے ساتھیوں کے خلوص، جاں نثاری اور جرأت کو سراہا ہے وہاں دہشت پسندی کے مسلک اور طریقۂ کار میں جو تضاد تھا اس کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ ان کا نصب العین سوشلزم تھا۔ وہ انگریزوں کو ملک سے نکال کر محنت کشوں کا پنچایتی راج قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ استحصالی طبقوں کی لوٹ مار ختم ہو۔ دولت پیدا کرنے کے تمام ذرائع۔ زمین، فیکٹریاں، بینک وغیرہ محنت کشوں کی مشترکہ ملکیت بن جائیں اور ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ ملے لیکن اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے مہم جوئی اور دہشت انگیزی سے کام نہیں چلتا کیونکہ محنت کشوں کا پنچایتی راج مار دھاڑ سے نہیں بلکہ سماجی انقلاب کے ذریعہ وجود میں آتا ہے اور سماجی انقلاب کی پہلی شرط یہ ہے کہ محنت کشوں اور ان کے حلیفوں کی جدوجہد کو طبقاتی بنیادوں پر آگے بڑھایا جائے۔ انھیں انقلابی ذہنوں کی تکمیل کے لیے منظم کیا جائے۔

درمیانہ طبقہ کے مٹھی بھر نوجوان خواہ اُن میں کتنی ہی لگن کیوں نہ ہو یہ فریضہ تنہا سرانجام نہیں دے سکتے۔ دہشت پسندوں کی بنیادی غلطی یہی تھی کہ وہ عوامی تحریکوں سے الگ تھلگ رہ کر یہ سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے انگریزوں پر بم پھینک کر وہ برطانوی سامراج کو مفلوج کر دیں گے اور وہ بوریا بستر باندھ کر یہاں سے چلا جائیگا۔ حالانکہ افراد کے قتل سے نہ ریاست کی نوعیت بدلتی ہے اور نہ طبقاتی رشتوں میں کوئی فرق آتا ہے ایک زار مارا جاتا ہے تو دوسرا زار اس کی جگہ تخت پر بیٹھ جاتا ہے ایک ساٹمرس ہلاک ہوتا ہے تو دوسرا ساٹمرس موجود ہوتا ہے۔

اجے کمار گھوش کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ آخری دنوں میں خود دہشت پسند جماعت کے رہنما اپنے طریقۂ کار کی خامیوں کو محسوس کرنے لگے تھے اور دہشت انگیزی ترک کر کے انقلابی تحریکوں میں شامل ہونے پر مائل ہو رہے تھے لیکن حالات نے اُن کو موقع نہیں دیا جیل میں رہ کر طریقۂ کار میں تبدیلی کا اعلان عزت نفس کی توہین ہوتی اور یہ انھیں ہرگز منظور نہ تھی۔

یہ مقالہ اجے کمار گھوش نے اب سے ۳۰ سال پیشتر لکھا تھا لیکن اس کی افادیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے بلکہ اس مقالے کے مطالعے سے ہمارے نوجوانوں کو اپنا طریقۂ کار متعین کرنے میں بڑی مدد ملے گی کیونکہ گذشتہ چند برسوں میں ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد ملکوں میں درباری اور فوجی سازشوں کا رجحان بہت بڑھا ہے۔ مملکت کے سربراہوں کو قتل یا برطرف کر دیا جاتا ہے اور پھر ریڈیو سے اعلان ہوتا ہے کہ ملک میں انقلاب آگیا ہے (ہمیں وہ دن یاد ہیں جب ایوب خاں اور ان کے ڈھنڈورچی اپنی لاصبانہ کارروائیوں کو "اکتوبر انقلاب" کا لقب دیا کرتے تھے) لیکن اس قسم کی حرکتیں لفنگا دائیں بازو کے افراد یا گروہ کرتے ہیں اور اُن کی پشت پر عام طور سے امریکی سامراج کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عوامی جماعتیں اس طرزِ عمل کے حق میں نہیں ہیں کیونکہ ان کی جنگ طبقاتی ہوتی ہے ذاتی نہیں ہوتی۔ عوام کو وڈیروں۔ ملکوں۔ سرداروں اور خانوں کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ انھیں ولیکا۔ داؤد۔ یا سہگل سے کوئی ذاتی پرخاش ہے۔ وہ تو ان طبقوں کے خلاف ہیں جن کے یہ افراد نمائندہ ہیں۔ ہر چند کہ ان

افراد کی ذاتی زندگی نہایت گھناؤنی ہے لیکن عوام جانتے ہیں کہ ان افراد کو راہ سے ہٹا دینے سے عوام کے مسائل حل نہیں ہونگے اور نہ طاقت کے توازن میں کوئی فرق آئے گا۔ اس کے لئے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے تمام جمہوری عناصر اپنے نصب العین کی خاطر کسی واضح لائحہ عمل کے تحت متحد ہو کر ان عناصر سے آمادہ پیکار ہوں جنھوں نے عوام کو ان کے پیدائشی اور انسانی حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

سبطِ حسن

ہماری انقلابی تاریخ کا ایک ورق

۳۰-۱۹۲۹ء کے لاہور سازش کے مقدمہ نے ہمارے ملک کے عوام کو جس طرح متحرک کیا اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔ جس دن سے اسمبلی میں بم پھینکا گیا۔ اس دن سے لے کر بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کی پھانسی تک سارے ملک کی توجہ اس مقدمہ کی روداد اس کے قیدیوں اور ان کی جد و جہد اور ان کے سیاسی نظریوں پر جمی رہی بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی سارے ملک کے ہیرو بن گئے۔ ان کے متعلق بے شمار واقعات اور افسانے مشہور ہو گئے۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں ان ہی کی جاں بازی اور حب الوطنی کے چرچے ہونے لگے۔ ہر طرف ان کے متعلق نظمیں لکھی جانے لگیں، ساری فضا انقلابی نعروں اور انقلابی گیتوں سے گونجنے لگی۔

یہ کون لوگ تھے جو ذرا سی دیر اس قدر مشہور ہو گئے؟ کس مقصد کے لئے انھوں نے اپنی جانوں کی بازی لگائی تھی؟ لوگوں کو ان سے اس قدر ہمدردی اور محبت کیسے ہو گئی؟ میں ان چند صفحوں میں ان ہی سوالات کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

غالباً ۱۹۲۳ء کا زمانہ تھا جب میں پہلی مرتبہ بھگت سنگھ سے ملا۔ وہ میری ہی طرح پندرہ سال کے تھے۔ بی۔ کے۔ دت نے کانپور میں مجھے ان سے ملایا تھا۔ اس وقت وہ دبلے پتلے اور لانبے سے تھے۔ جسم پر کپڑے پرانے اور میلے تھے بہت ہی خاموش معلوم ہوتے تھے جیسے کہ دیہاتی لڑکے ہوتے ہیں جن میں نہ چستی ہوتی ہے اور نہ خود اعتمادی پہلی ملاقات

کا اثر مجھ پر بہت خراب پڑا چنانچہ ان کے جانے کے بعد میں نے وقت سے اس کا تذکرہ بھی کیا۔

چند دن کے بعد مجھے پھر ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور ہم نے تفصیل سے باتیں کیں۔ وہ زمانہ تھا جبکہ ہم لڑکپن کی ترنگ میں انقلاب کے ہوائی قلعے باندھا کرتے تھے۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ اب انقلاب آیا ہی چاہتا ہے۔ دو چار سال ہی کی بات ہے۔ بھگت سنگھ کو اتنا یقین نہیں تھا۔ مجھے ان کے الفاظ تو یاد نہیں ہیں۔ لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ انھوں نے کہا تھا کہ ملک میں بے حسی اور جمود چھایا ہوا ہے۔ عوام کو بیدار اور متحرک کرنا بڑا مشکل ہے اور یہ چیز ہمارے لئے بڑی رکاوٹ ہے۔ ان باتوں کے بعد تو ان کے متعلق میری پہلی رائے اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔

ہم جب باتوں باتوں میں پرانے انقلابیوں کا ذکر کرتے اور ۱۹۱۵-۱۶ء کے شہیدوں اور خاص طور پر لاہور کے پہلے سازشی مقدمہ کے روح رواں سردار کرتار سنگھ کا ذکر آتا تو بھگت سنگھ کا انداز ہی بدل جاتا اور جوش کی ایک لہر ان پر طاری ہو جاتی۔ ہم میں سے کوئی بھی کرتار سنگھ سے نہیں ملا تھا۔ اس لئے کہ ہم بچے ہی تھے جب انھیں پھانسی دے دی گئی تھی لیکن ہمیں معلوم تھا کہ کس طرح ۱۸ سال کی عمر میں وہ غدر پارٹی کے لیڈر بن گئے تھے یہ وہ پارٹی تھی جس میں بابا سوہن سنگھ بھکنا، بابا وساکھا سنگھ اور پرتھوی سنگھ آزاد جیسے انقلابی شریک تھے۔ ان انقلابیوں نے ۱۹۱۵-۱۶ء میں ایک انقلابی جماعت بنائی تھی اور اس کی کوشش کی تھی کہ انگریزوں کے خلاف مسلح بغاوت کی جائے۔ کرتار سنگھ کی بے جگری، جاں بازی اور تنظیمی قابلیت کا لوہا ان کے دشمن تک مانتے تھے۔ میں تو گویا ان کی پوجا کرتا تھا اور جب کوئی شخص ان کا ذکر کرتا اور ان کے کارنامے بیان کرتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ اس زمانہ سے میں آہستہ آہستہ بھگت سنگھ کو پسند کرنے لگا۔ ان کے کانپور جانے سے قبل ہی ہم گہرے دوست ہو گئے۔ اگرچہ میں ان کا اکثر مذاق اڑایا کرتا کہ وہ حالات سے اتنے مایوس تھے۔

کاکوری کی گرفتاریاں اور اس کے بعد

١٩٢٥ء میں یکایک کاکوری کی گرفتاریوں کا حادثہ پیش آیا۔ چند ہی ہفتے کے اندر ہمارے اکثر لیڈر جیل میں بند کر دیئے گئے۔ تلاشیاں اور گرفتاریاں روز کا قصہ بن گئیں۔ کسی پر ذرا بھی شبہ ہوتا تو اسے دھر لیا جاتا۔ ان سب چیزوں سے میں اتنا متاثر نہیں ہوا جتنا کہ ان کے اثرات سے۔ وہ لوگ جو ہمارے مقصد سے ہمدردی کا اظہار کیا کرتے تھے، اب کترانے لگے۔ وہ لوگ جو انقلاب کی لمبی چوڑی باتیں بنایا کرتے تھے، ہمارے جتنا زیم سے بھاگنے لگے۔ یہ جتنا زیم ہم نے کانپور میں قائم کیا تھا تاکہ نئے کارکن بھرتی کئے جائیں اور انھیں ورزش جسمانی کی تعلیم دی جائے۔ سارے صوبہ میں خوف و دہشت پھیل گئی۔

١٩٢٦ء میں الہ آباد چلا گیا تاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لوں۔ ہم نے وہاں کوشش کی کہ کاکوری کی گرفتاریوں کے بعد جو لوگ بچ رہے ہیں، انھیں اکٹھا کر کے پارٹی کو پھر سے منظم کیا جائے۔ یہ بڑا ہی مشکل کام تھا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انقلاب ابھی بہت دور ہے۔

انقلابی نوجوانوں میں جو بیچارگی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا وہ انھیں دہشت پسندی کی طرف اس لئے لے گیا کہ ملک کے سیاسی حالات ہی ایسے تھے۔ ٢٢-١٩٢١ء کی عوامی جدوجہد کے بعد کانگریس ٹوٹ کر دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک وہ جو جدوجہد جاری رکھنا چاہتے تھے اور دوسرے وہ جو قانونی طریقہ سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔ سوراج پارٹی کو جیت ہوئی اور اسے گاندھی جی کی پوری تائید حاصل تھی۔

اسمبلیوں کے باہر کسی قسم کی سیاسی زندگی نہیں تھی۔ جلسے بہت کم ہوتے تھے ہوتے بھی تو ان میں بہت کم لوگ آتے تھے۔ ملک میں ایک جمود اور سکون چھایا ہوا تھا ایسا سکون جو ٹھہرے ہوئے پانی میں ہوتا ہے۔

ہمارے ساتھیوں میں اس پر بڑے مباحثے ہوئے کہ اس جمود کو توڑنے کے لئے

گیا کیا جائے. اشتراکی لٹریچر آہستہ آہستہ ملک میں آ رہا تھا، اس کی بھی جڑیں آ رہی تھیں کہ روس میں مزدوروں اور کسانوں نے انقلاب کر کے اشتراکی نظام قائم کر دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ اشتراکی حکومت سامراجیوں کے خلاف ایشیائی قوموں مثلاً چین اور ترکی کی مدد کر رہی تھی. ان چیزوں نے ہماری توجہ اس اشتراکی ریاست اور اس کے اصولوں کی طرف پھیر دی.

اسی کے ساتھ ہمارے ملک میں بھی ایک نیا واقعہ ہو رہا تھا اگرچہ اس کی اہمیت ہم اس وقت پوری طرح محسوس نہ کر سکے. ایسے زمانہ میں جبکہ سارے ملک میں جمود سے دم گھٹا جا رہا تھا گرنی کام گار یونین کی سرگرمی میں بمبئی کے مزدوروں نے بہت بڑی ہڑتال کر دی تھی. کلکتہ اور کانپور میں بھی ہڑتالوں کی لہر اٹھ رہی تھی اس نے سارے ملک والوں کی توجہ اس طرف پھیر دی.

ان حالات میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ صرف دہشت پسندی اور عوام کے دشمنوں کے خلاف مسلح جدوجہد سے ہم عوام کو بیدار اور متحرک کر سکتے ہیں. لیکن یہ بات بھی صاف تھی کہ صرف دہشت پسندی سے آزادی نہیں مل سکتی. ہمارے سامنے یہ بات ابھی صاف نہیں تھی کہ دہشت پسندی سے عوام میں جو حرکت پیدا کی جائے گی تو اُسے کس راہ پر لگایا جائیگا اور انگریزی حکومت کو شکست دینے کے بعد اس کی جگہ کس قسم کی حکومت آئے گی. اس قسم کے سوالات ہمارے ساتھیوں کے دلوں میں پیدا ہونے لگے تھے.

اس زمانہ میں بھگت سنگھ پنجاب میں سرگرم تھے. انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے ایک "نوجوان بھارت سبھا" قائم کی تھی یہ انقلابی نوجوانوں کی جماعت تھی جو کہ اشتراکی خیالات کا پرچار کرتی تھی اور اس کی اہمیت بتلاتی تھی کہ صرف راست عمل سے برطانیہ کو شکست دی جا سکتی ہے. اس سبھا کی مدد سے دہشت پسند پارٹی کے لئے نوجوان بھرتی کئے جاتے تھے. یہ سبھا پنجاب کے نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوتی اور پنجاب

کے نوجوانوں کے نقطۂ نظر کو بدلنے میں اس نے بڑا حصہ لیا۔

بھگت سنگھ نے کچھ دن "کرتی" نامی رسالہ میں بھی کام کیا۔ یہ ایک اشتراکی رسالہ تھا اور اس کے ایڈیٹر سوہن سنگھ جوش تھے۔

ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن اسوسیئیشن

۱۹۲۸ء میں ایک دن میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص یکایک داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ یہ بھگت سنگھ تھے۔ لیکن ان میں اور دو سال پہلے کے بھگت سنگھ میں بڑا فرق تھا۔ اب وہ اونچے پورے اور تنومند ہو گئے تھے۔ چہرے اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ جب میں نے ان سے باتیں کیں تو میں نے محسوس کیا کہ نہ صرف عمر میں بلکہ تجربہ اور قابلیت میں بھی وہ کئی سال آگے نکل چکے تھے۔

وہ چندر شیکھر آزاد کے ساتھ تھے جو اس وقت ہماری پارٹی کے لیڈر تھے کاکوری سازش کی گرفتاریوں سے صرف وہی ایک تھے جو بچ نکلے تھے اور اس وقت روپوش تھے۔ اس ملاقات میں انھوں نے پارٹی کا نیا پروگرام بتلایا اور یہ بھی بتلایا کہ تنظیم میں اب کیا کیا تبدیلیاں کی گئی تھیں۔

اب ہماری پارٹی کا نام "ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن اسوسیئیشن" ہو گیا تھا اور ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اشتراکی راج قائم کیا جائے۔ اس کے علاوہ پارٹی کی ایک مرکزی کمیٹی بنائی گئی اور اس کے تحت صوبہ واری اور ضلع واری کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ اصول یہ طے پایا کہ ان کمیٹیوں میں اکثریت جو تصفیہ کرے گی اس پر سب کو پابند ہونا پڑے گا۔

اس وقت کا سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ آزادی اور اشتراکیت کی لڑائی کس طرح لڑی جائے۔ اس کے لئے یہ طے پایا تھا کہ مختلف گروہ اور کچھ لوگ انفرادی طور پر دہشت کاری کریں۔ ہمارا خیال تھا کہ اس کے بغیر اعتدال پسندی کی خواب آور افیون کا نشا ٹوٹ نہیں سکتا

ورنہ اس خوف کو دور کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے عوام ایک ہو کر اپنے حاکموں کے خلاف نہیں اٹھ کھڑے ہوتے۔ ہم سمجھتے تھے کہ جیسے ہی ہم مناسب موقع پر اور مناسب مقامات پر کارروائی کریں گے اور ایسے سرکاری افسروں پر حملہ کر کے قتل کریں گے جن سے عوام کو سخت نفرت ہے تو عوام کا یہ خوف ختم ہو جائے گا۔ عوامی تحریک کی ایک لہر سارے ملک میں اٹھ کھڑی ہوگی۔ ہم اپنے کو اس تحریک سے وابستہ کر لیں گے۔ ہم گویا اس کے ایک ہتھیار بند دستہ کا کام دیں گے اور اس تحریک کی اشتراکی نظام کی طرف رہبری کریں گے۔

اس تحریک میں ہمارے حصہ لینے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ آزاد ہندوستان لازمی طور پر اشتراکی ہندوستان ہوگا۔

اس زمانہ میں اور اس کے بعد جو شخص بھی بھگت سنگھ سے ملا، اس پر ان کی غیر معمولی ذہانت اور عزم کا اثر تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بڑے اچھے مقرر تھے بلکہ ان کی باتوں میں اتنا جوش، اتنی قوت، اور اتنا خلوص ہوتا تھا کہ کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس ملاقات کے بعد ہم پوری رات باتیں کرتے رہے اور صبح ہوتے ہوتے باہر نکلے تو افق پر سرخ شفق کی لکیر ابھر رہی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہماری پارٹی کے افق پر بھی ایک نئی شفق پھول رہی ہے اب ہمیں معلوم تھا کہ ہماری منزل مقصود کیا ہے اور اس تک پہنچنے کا راستہ کون سا ہے۔

یہ تھی ہماری اس زمانہ کی اشتراکیت۔ ہمیں اپنے قومی لیڈروں پر اور ان کی اعتدال پسندی پر کوئی اعتماد نہیں رہا تھا۔ ان کے نعروں اور سیاسی چالبازیوں سے ہمیں وحشت اور نفرت ہونے لگی تھی۔ اور ہم سمجھتے تھے کہ ہم اپنے کام سے ملک میں ایک حرکت پیدا کر دیں تو خود عوام میں نئے نئے انقلابی لیڈر ابھریں گے۔ اشتراکیت ہماری منزل مقصود تھی اور ہم سمجھتے تھے کہ جیسے ہی قوت ہمارے ہاتھ میں آئے گی۔ ہم اس سے اشتراکی نظام قائم کرنے میں مدد لیں گے۔

پہلا وار

۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا اور سارے ملک میں ہڑتالیں اور مظاہرے ہونے لگے۔ بمبئی کے مزدوروں نے نہایت شاندار ہڑتال کی۔ جہاں جہاں کمیشن جاتا "سائمن واپس جاؤ" کے نعرے اور کالی جھنڈیاں اس کا استقبال کرتیں۔ ۱۹۲۱ء کی سول نافرمانی کے بعد ایسے نظارے دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔

اسی زمانے میں یہ خبر آئی کہ لاہور کے ایک مظاہرے میں پولیس نے لاٹھیاں اور گولیاں چلائیں۔ مجمع کو منتشر کر دیا اور لالہ لاجپت رائے جو اس کی رہبری کر رہے تھے وہ بھی زخمی ہوئے، اور کچھ دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعہ نے سارے ملک میں غم و غصّہ کی لہر دوڑا دی۔

لیکن غم و غصّہ کے ان جذبات کے ساتھ عوام میں بے بسی کی بھی ایک لہر تھی ہزاروں آدمیوں کے سامنے ان کا ایک محبوب لیڈر مارا جاتا ہے اور وہ کچھ نہیں کر سکتے وہ ہزاروں مجرموں کو کوئی سزا نہیں دے سکتے۔

ہماری پارٹی نے تصفیہ کیا کہ اس وقت اقدام کرنا چاہیئے۔ نومبر ۱۹۲۸ء میں لاہور کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سانڈرس پر جس نے لاہور میں مظاہرہ کرنے والوں پر لاٹھیاں چلوائی تھیں۔ پولیس ہیڈ کوارٹر کے سامنے حملہ کیا گیا اور اُسے قتل کر دیا گیا۔ یہ حملہ اس قدر موقع پر ہوا تھا اور اس قدر جانبازی اور بہادری سے کیا گیا تھا کہ سارے ملک میں خوشی اور جوش کی لہر دوڑ گئی۔ ہم سمجھتے تھے کہ موقع پر ایک حملے سے عوام کو متحرک کیا جا سکتا ہے اور یہیں اس میں بڑی کامیابی ہوئی۔

اسمبلی پر بم پھینکا گیا

حالات اب تیزی سے بدلنے لگے دسمبر ۱۹۲۸ء میں کانگریس نے اپنے کلکتہ کے اجلاس میں یہ تحریک منظور کی کہ اگر ایک خاص مدت کے اندر ہندوستان کو

نوآبادیات کا درجہ نہیں دیا گیا تو وہ "مکمل آزادی" کو اپنا مقصد قرار دے گی۔ ملک میں بے حسی اور جمود کی چادر کئی سال سے چھائی ہوئی تھی۔ وہ چھٹنے لگی۔ ملک کے کونے کونے میں نوجوانوں کی سبھائیں بننے لگیں اور بمبئی میں ایک بہت بڑی ہڑتال کی تیاری ہونے لگی۔

ہم سب محسوس کرنے لگے کہ ۲۲-۱۹۲۱ء کی طرح عوام کی بہت بڑی تحریک آنے والی ہے۔ ہم بھی بہت تیزی سے تیاری کرنے لگے تاکہ اس میں اپنا فرض ادا کر سکیں۔ ہتھیار اور پیسے جمع کئے جانے لگے۔ اپنے کارکنوں کو ہتھیاروں کے استعمال کی تعلیم دی جانے لگی۔ جتین داس کو بنگال سے بلایا گیا تاکہ ہم لوگوں کو بم بنانے کی تعلیم دیں۔

اپریل ۱۹۲۹ء میں تمام اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں سے یہ خبر چھپی کہ سارے ملک کے کمیونسٹ اور مزدور رہنما اور کارکن گرفتار کئے جا رہے ہیں۔ پی سی جوشی بھی گرفتار کر لئے گئے۔ اس زمانہ میں یہ الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ اور نوجوانوں کی سبھا کے لیڈر تھے۔ ان کی گرفتاری پر طلباء نے بہت بڑا مظاہرہ کیا۔

بھگت سنگھ اور ہمارے دوسرے ساتھی اس سے پہلے کئی کمیونسٹ لیڈروں سے مل چکے تھے۔ ہمیں ان سے بڑی ہمدردی اور دلچسپی تھی اور ایک زمانہ میں تو ہم یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ان سے عملی تعاون کی راہ نکالی جائے۔ کمیونسٹ عوام کو منظم کریں اور عوامی تحریک چلائیں اور ہم "ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسیشن" کے لوگ ان کے مسلح دستہ کے طور پر کام کریں۔ لیکن جب ہمیں اس کا علم ہوا کہ کمیونسٹ انفرادی طور پر مسلح کارروائی کرنے کے خلاف ہیں اور اسے آزادی کی تحریک کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہیں تو پھر ہم نے یہ خیال ترک کر دیا۔

ہم کمیونسٹوں کو انقلابی نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ ہم مسلح کارروائی کو ہی انقلاب سمجھتے تھے۔ لیکن بہت ساری چیزوں میں وہ ہم سے بہت قریب تھے۔

انھیں بھی سامراجیوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ بھی قومی لیڈروں کی اعتدال پسندی کے خلاف تھے۔ وہ بھی جدوجہد کے حامی تھے اور ان کی بھی منزل مقصود اشتراکیت تھی۔

چنانچہ جب سارے ملک میں کمیونسٹوں کی گرفتاریاں ہونے لگیں۔ تو ہم لوگ بہت متاثر ہوئے۔ اس لئے کہ اس سے انقلابی مورچہ کے ایک بازو پر زد پڑ رہی تھی۔ سامراج ایک ایسے مقصد کے خلاف برسرِ پیکار تھے جو ہمارا اپنا مقصد تھا اور ایک ایسی تحریک کو کچلنا چاہتے تھے جس سے ہمیں ہمدردی اور محبت تھی۔ ہم نے طے کیا کہ نہ صرف اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے بلکہ ساری سامراجی پالیسی کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے۔ ایک طرف وہ لوگوں کو نئے دستور کا سراب دکھلانا چاہتی تھی دوسری طرف عوام کو دہشت پسندی سے کچلنا چاہتی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی روز بعد مرکزی اسمبلی میں مزدور سبھاؤں کے متعلق ایک بل کے پاس ہونے کے بعد ہی (جس میں مزدور تحریک کے خلاف کئی قانون رکھے گئے تھے) بم پھینکا۔ بھگت سنگھ اور دت وہیں گرفتار کر لئے گئے۔

اس کے بعد اتفاق سے حکومت کو ہماری لاہور کی بم فیکٹری کا پتہ لگ گیا اور سکھدیو، کشوری لال اور ہمارے دوسرے ساتھی گرفتار کر لئے گئے۔ جئے گوپال اور ان کے بعد ہنس راج اوھورلے نے اقبال کر لیا اور اس کی وجہ سے بہار، پنجاب، یوپی وغیرہ میں ہمارے بہت سارے عملی کارکن گرفتار ہو گئے۔ بہت سارے روپوش ہو گئے۔ میں بھی روپوش ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ مجھے بھی پولیس نے گرفتار کر لیا۔

ہمیں ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہمارے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ ہماری امید پر اوس پڑ گئی۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ ہمارے تقریباً سات ساتھی ایسے کمزور دل ثابت ہوئے کہ وہ پولیس کے مظالم سہہ نہ سکے اور انھوں نے سب باتوں کا اقبال کر لیا۔ ان میں سے دو مرکزی کمیٹی کے بھی رکن تھے۔

مقدمہ کی ابتدا

جولائی ۱۹۲۰ء میں ہمارے تیرہ ساتھیوں کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ یہاں بھگت سنگھ اور دت سے پہلی ملاقات ہوئی۔ بھگت سنگھ کی اب وہ صحت نہیں رہی تھی، ایک زمانہ میں ان کے جسم کی خوبصورتی کا ہماری پارٹی میں عام چرچا تھا۔ اب وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ عدالت میں انھیں اسٹریچر پر لانا پڑا کیونکہ پولیس ان کو سخت جسمانی تکلیفیں پہنچا رہی تھی اور ادھر کئی روز سے انھوں نے بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔[1] سیاسی قیدیوں کے ساتھ انسانوں کا سا برتاؤ کرنے پر حکومت کو مجبور کیا جائے ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو سلام کیا۔ ہماری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

اگرچہ بھگت سنگھ اور دت کو بم کے سلسلہ میں عمر قید کی سزا مل چکی تھی لیکن اب وہ ہمارے ساتھ ۱۹۲۹ء کے لاہور سازش کے مقدمہ میں ملزم کی حیثیت سے پیش ہوتے تھے۔ تین دن تک تو ہم نے عدالت کی کارروائی پر کوئی توجہ نہیں کی اور آپس میں بحث مباحثہ کرتے رہے کہ ہمیں اپنی مدافعت کے لئے کونسی راہ عمل اختیار کرنی چاہیئے اس میں بھگت سنگھ نے سب سے زیادہ حصہ لیا اگرچہ وہ اتنے کمزور تھے کہ ان کے لئے آرام کرسی کا بندوبست کرنا پڑا تھا۔

جس بات پر انھوں نے زیادہ زور دیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ ہمیں مایوس بالکل نہیں ہونا چاہئے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ہماری تحریک ختم ہو گئی۔ ہمیں اپنی مدافعت اس طرح نہیں کرنی چاہیئے جس طرح ایک ملزم کرتا ہے۔ اگرچہ کہ اس کی کوشش

---

[1] بجوئے سنہا اور ان کے گروہ مقدمہ شروع ہونے کے بعد گرفتار ہوئے بھگوتی داس[?] سیوا لاب کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہیں، بعد ازاں میں گرفتار ہوئے اور لانبی سزا ملی۔ بہت سارے ساتھیوں پر ڈاکہ کے الزام میں بعد میں مقدمے چلائے گئے۔

ضرور کرنی چاہیئے کہ جتنے لوگ بچ سکیں انھیں بچا لیا جائے۔ ہمیں مقدمہ اس طرح لڑنا چاہیئے کہ اس سے ہمارے سیاسی مقصد میں مدد ملے ہمیں ہر موقعہ پر سامراجی انصاف کی پول کھولنی چاہیئے اور یہ بتلانا چاہیئے کہ انقلابیوں کی قوت ارادی کو کچلا نہیں جا سکتا۔ نہ صرف اپنے بیانوں کے ذریعہ بلکہ عدالت اور جیل میں ہمیں تمام سیاسی قیدیوں کے لئے لڑنا چاہیئے۔ حکومت کی ہر بات کی ہر جگہ مخالفت کرنی چاہیئے اور انھیں یہ بتانا چاہیئے کہ ہم ان کی عدالت، ان کی پولیس اور ان کے ہر ادارے کو کس قدر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح ہمیں چاہیئے کہ جو کام ہم نے باہر شروع کیا تھا اسے قید میں بھی جاری رکھیں۔ یعنی اپنے عمل سے عوام کو بیدار کریں، انھیں متحرک کریں۔

ان باتوں نے ہم میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ چنانچہ پہلا قدم ہم نے یہ اٹھایا کہ ہم بھی بھگت سنگھ اور دت کے ساتھ بھوک ہڑتال میں شریک ہو گئے ہمارے بنیادی مطالبات یہ تھے کہ تمام سیاسی قیدیوں کو ایک ہی کلاس میں رکھا جائے۔ ان کو بہتر غذا دی جائے۔ اخبارات اور کتابیں مہیا کی جائیں اور لکھنے پڑھنے کی دوسری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

بھوک ہڑتال

لاہور سازشی مقدمہ کی یہ مشہور و معروف بھوک ہڑتال ۶۳ دن جب کہ جتین داس اس کی نذر ہو گئے اور جس نے سارے ملک میں زبردست ہیجان برپا کر دیا۔

شروع میں تو حکومت اور جیل کے افسروں نے اس کو کچھ اہمیت نہیں دی اُن کا خیال تھا کہ چند دن میں یہ خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اس خیال کو تقویت اس بھی اس وجہ سے ہوئی کہ چند روز بعد ۲ قیدیوں نے ہڑتال ترک کر دی۔ ہم میں سے بعض ایسے تھے جنھیں پورا اعتماد نہیں تھا کہ کتنے روز چل سکے گی اور میں خود یہ سوچتا تھا کہ

کتنے دن تک بھوکا رہ سکوں گا۔ ہم سب لوگ پہلے بڑی سختیاں اٹھا چکے ہے۔ پولیس کے مظالم کا اب ہم پر اثر نہیں ہوتا تھا لیکن یہ خیال کر دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں بلیر کچھ کھائے ہوئے رہنا واقعی بڑا صبر آزما تھا۔

شروع میں دس دن تک تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ کچھ لوگ ضرور ایسے تھے جو ایک ہفتہ بعد ہی بستر سے لگ گئے اور عدالت میں سارے سارے دن بیٹھے رہنے سے وہ تھک جاتے تھے لیکن ہمیں شروع میں جو دہشت تھی۔ وہ اب ختم ہو چکی تھی۔ اب ہم محسوس کرنے لگے تھے کہ بھوک ہڑتال ایسی کوئی مشکل چیز نہیں ہے لیکن ہمیں اس وقت تک اس کا احساس نہیں تھا کہ حقیقی لڑائی تو آئندہ آنے والی تھی۔

دس دن کے بعد سے سرکاری افسروں نے زبردستی غذا دینے کی کوشش شروع کی۔ ''ہم دونوں ہم لوگ علیحدہ علیحدہ کوٹھریوں میں رکھے جاتے تھے۔ ڈاکٹر آتا اور اپنے ساتھ کئی ہٹے کٹے اور توانا نمبردار قیدیوں پر پہرہ دینے والے، ساتھ لاتا۔ بھوک ہڑتالی کو زبردستی فرش پر لٹا دیا جاتا اور اس کی ناک میں زبردستی ربڑ کی نالی داخل کرکے اس کے ذریعہ دودھ پہنچانے کی کوشش کی جاتی۔ ہم بہت ہاتھ پاؤں مارتے سخت مزاحمت کرتے لیکن اس کا اثر نہ ہوتا اور ہم یہ محسوس کرنے لگے کہ انھوں نے ہمیں نیچا دکھا دیا۔

بھوک ہڑتال کے انیسویں دن مجھے اطلاع ملی کہ جتین داس کی حالت خراب ہے اور انھیں جیل کے ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ شروع میں تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ داس کو کیا ہو گیا۔ چند ہی گھنٹے پہلے تو اچھا خاصا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد جیل کے ایک چھوٹے افسر نے جو مجھے پہلے خبر دے گیا تھا۔ بتلایا کہ جب زبردستی غذا دی جا رہی تھی تو اس وقت کچھ ہو گیا اور داس بیہوش پڑے ہیں۔

یہ خبر بڑی تکلیف دہ تھی۔ ہم میں سے اکثر گرفتار ہونے سے پہلے داس سے

نہیں ملے تھے لیکن ان چند دنوں میں جو ہم ساتھ رہے تو سب کو ان سے محبت ہوگئی تھی۔ اگرچہ وہ بہت خاموشی پسند تھے لیکن بڑے ذہین اور خوش مذاق تھے۔ ہمیشہ لطیفے اور کہانیاں سُنا کر سب کو ہنسایا کرتے تھے۔

میں نے جیلر کو بلوایا اور اسے مجبور کیا کہ مجھے ہسپتال جانے کی اجازت دے۔

میں ہسپتال پہنچا تو وہاں دیکھا کہ داس ایک پلنگ پر بے ہوش پڑے ہیں۔ اور ان کے اطراف ڈاکٹر ہوش میں لانے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں اسی رات ان کا انتقال نہ ہو جائے۔ انھیں ہوش تو آگیا لیکن نمونیا ہوگیا جس سے وہ بہت کمزور ہو گئے۔ انھوں نے دوا پینے یا غذا کھانے سے قطعاً انکار کر دیا۔ زبردستی کوئی چیز دینے کا کوئی سوال ہی اب نہیں تھا۔

اس کے بعد سے ہڑتال نے ایک نئی اور نازک شکل اختیار کر لی۔ داس کے بعد شیو درما اور دوسرے ساتھیوں کی باری آئی اور ہسپتال بھر گیا۔ عدالت کی کارروائی ملتوی کر دی گئی۔

اب تو گویا موت کے لئے دوڑ شروع ہوگئی۔ اب تو آپس میں اس کا مقابلہ شروع ہوگیا کہ پہلے کون مرتا ہے۔

ڈاکٹروں کو نیچا دکھلانے کے لئے ہم نے بے شمار طریقے نکال لئے۔ کشوری نے سرخ مرچ منہ میں بھر لی اور اس پر گرم پانی چڑھا لیا تاکہ حلق خراب ہو جائے اور اگر ڈاکٹر منہ میں ربر کی نلی ڈالے تو اتنی کھانسی آئے کہ وہ نکالنے پر مجبور ہو جائے۔ جب زبردستی دودھ پلایا گیا تو میں نے مکھیاں پکڑ کر کھالیں تاکہ قے ہو جائے اور سارا دودھ نکل جائے۔ ڈاکٹروں کو ہماری یہ چالیں معلوم تھیں اس لئے وہ ہم پر باقاعدہ پہرہ بٹھلاتے تھے

ڈاکٹر بھی ہماری قوت ارادی کو توڑنے کے لئے نئی نئی ترکیبیں کرتے۔ ایک دن ہمارے کمرے سے پانی کے تمام برتن ہٹا لئے اور اس کی جگہ برتنوں میں دودھ بھر کر رکھ

یہ سب سے سخت اور مشکل امتحان تھا۔ ایک دن گذرنے کے بعد پیاس برداشت سے باہر ہو گئی۔ میں ہر برتن کے پاس اس امید میں جاتا کہ شاید اس میں پانی ہو۔ اسس میں دیکھتا کہ دودھ بھرا ہوا ہے تو واپس آجاتا۔ یہ چیز مجھے پاگل بنائے دے رہی تھی۔ جس شخص نے ہمارے لئے یہ تدبیر سوچی تھی۔ اگر وہ میرے سامنے آجاتا تو میں اُسے قتل کر دیتا۔

باہر پہرہ دار ہر وقت بیٹھے رہتے ہر لمحہ خاموشی سے نگہبانی کرتے رہتے۔

مجھے خود اپنے آپ پر سے بھروسا اٹھنے لگا۔ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اگر چند گھنٹے اور اسی طرح گذر گئے تو مجھے ہار ماننی ہوگی اور دودھ پینے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا زبان پھول گئی تھی۔

میں نے پہرہ دار کو اندر بلایا اور اس سے کہا کہ میرے لئے پانی لا دے۔ چاہے چند قطرے ہی کیوں نہ ہوں۔ اس نے جواب دیا "میں نہیں کر سکتا مجھے اس کی اجازت نہیں ہے۔" میں غصّہ سے بے قابو ہو گیا۔ میں نے دودھ کا برتن اٹھا کر دروازہ پر پھینک مارا برتن ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور دودھ سے پہرہ دار کے تمام کپڑے بھیگ گئے وہ خوفزدہ ہو کر بھاگا۔ وہ سمجھا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اس کا خیال حقیقت سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔

اسی کرب میں کشوری اور دوسرے ساتھی بھی مبتلا تھے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ہر ایک نے وہی حرکت کی تھی جو میں نے کی تھی یعنی دودھ کا برتن پھینک دیا تھا۔

جیلر کو آخر کار جھکنا پڑا اور ہمارے کمرے میں پانی بھیجنا پڑا ہم پانی کو دیکھ کر ان پر ٹوٹ پڑا اور بے تحاشا پینے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سخت متلی اور قے ہونے لگی اور سارا پانی نکل گیا۔

اسی دوران جہاں جہاں سیاسی قیدی تھے انھوں نے بھی ہماری ہمدردی میں بھوک ہڑتال کر دی۔ ہمارے مطالبات کی تائید میں سارے ملک میں بہت بڑی عوامی

تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی. ملک کے کونے کونے میں جلسے اور مظاہرے ہونے لگے.

چند دن کے بعد ہی میرٹھ سازش کے قیدیوں نے بھی بھوک ہڑتال کر دی. اس کی خبر ساری دنیا میں پھیل گئی. انگلستان میں ہیجان پیدا ہو گیا. ساری دنیا کی توجہ ہندوستان کی جیلوں پر مرکوز ہو گئی.

بھوک ہڑتال کے زمانہ میں بھگت سنگھ کئی مرتبہ ہمارے جیل میں مشورہ کا بہانہ کر کے آئے مگر اصل میں ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ہم لوگوں سے ملیں اور ہماری حالت کا پتہ لگائیں. اگرچہ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے لیکن وہ داس اور دوسرے ساتھیوں کے پاس بڑی دیر تک بیٹھتے اور ہمت بڑھاتے. صرف ان کی موجودگی سے ہم میں ایک نئی زندگی کی لہر آ جاتی. ہم بڑی بے چینی سے اس دن کا انتظار کرتے رہتے جب وہ ہمارے یہاں آتے.

آخر کار جب جتین داس موت کے منہ میں آ گئے اور شیو ورما اور دوسرے بعض ساتھیوں کی حالت بہت نازک ہو گئی تو حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے. ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں غیر سرکاری آدمیوں کی اکثریت تھی تاکہ وہ جیل کے قوانین میں تبدیلی کرنے کی سفارش پیش کرے. کمیٹی نے آکر ہم سے جیل میں ملاقات کی اور یہ یقین دلایا کہ ہمارے اکثر مطالبات تسلیم کر لئے جائیں گے اور اس کی بنا پر ہم نے ہڑتال ختم کر دینے کا تصفیہ کیا.

جتین کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی. نہ وہ بات کر سکتے تھے اور نہ سن سکتے تھے. اس وقت یہ احساس تھا کہ فتح ہماری ضرور ہوگی لیکن اس فتح کے لئے جس نے سب سے زیادہ قربانی دی وہ آج اس کا ثمر پانے سے محروم ہے. وہ موت کے منہ میں لیٹا ہوا تھا اور ہم سب اس کے بستر کے اطراف جمع تھے میرے حلق میں پھندا پڑنے لگا. چند منٹ میں اس کی روح پرواز کر گئی اور میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو جیل کے سنگدل افسروں کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے. جیل کے باہر بہت بڑا مجمع اس کے جنازے کے لئے جمع تھا. جب اُسے باہر نکالا گیا تو بھیٹش بادونگ

سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور نے ٹوپی اتار کر تعظیم پیش کی۔ یہ تعظیم ایک ایسے آدمی کی تھی۔ جسے برطانوی سلطنت کی ساری قوت بھی دبا نہ سکی۔

حکومت نے ہم سے جو وعدے کئے تھے، بعد میں چل کر اس سے کترانے لگی۔ اس کی خلاف توجیہیں کرنے لگی۔ بہت سارے سیاسی قیدیوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اس سے دوا اور بھوک ہڑتالیں کرنا پڑیں۔ لیکن سارے ملک کی توجہ اس پر مبذول ہوگئی کہ ہمارے ملک کے جیلوں کی حالت کس قدر خراب تھی۔

اس بھوک ہڑتال کے زمانے میں ایک واقعے نے ہمارے دلوں کو بہت گرما دیا۔ بابا سوہن سنگھ بھکنا جو غدر پارٹی کے بانیوں میں تھے اور ۱۶-۱۹۱۵ء کے لاہور سازش کے مقدمہ کے ہیرو تھے اس زمانہ میں لاہور جیل ہی میں تھے۔ انھوں نے بھی ہماری ہمدردی میں بھوک ہڑتال کر دی تھی۔ وہ ہندوستان اور انڈمان کے جیلوں میں چودہ سال کاٹ چکے تھے اور اب رہا ہونے والے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے ہم سے آکر کہا کہ اگر وہ ہڑتال پر اصرار کریں گے تو انھیں اور زیادہ دن جیل میں رہنا ہوگا ان کی کچھ سزا جو معاف ہوئی وہ رعایت باقی نہ رہے گی۔ باباجی اس وقت کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ چودہ سال کی قید کی دوزخ نے ان کی صحت بالکل برباد کر دی خطرہ تھا کہ ان کی بھوک ہڑتال کے نتائج برے نہ نکلیں۔

بھگت سنگھ باباجی سے ملے اور ان سے درخواست کی کہ وہ ہڑتال ترک کر دیں لیکن انھوں نے نہیں مانا۔ بھگت سنگھ نے اپنی ملاقات کا حال ہم سے بیان کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ باباجی نے اس وقت تک ہڑتال جاری رکھی جب تک ہماری ہڑتال رہی، اس کی وجہ سے انھیں ایک سال اور جیل میں کاٹنا پڑی۔

○

بھگت سنگھ

عام روایتی دہشت پسند لیڈروں میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ بھگت سنگھ میں نہیں تھیں۔ اکثر باتوں میں ہم میں آپس میں اختلافات ہوتے تھے۔ بہت گرماگرم بحثیں ہوتی تھیں لیکن اکثریت سے جو فیصلہ ہوتا تھا وہ سب کو ماننا پڑتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ بعض چیزیں ایسی طے ہوئیں جس کے بھگت سنگھ خلاف تھے۔ لیکن انھوں نے اکثریت کے فیصلہ کی پابندی کی۔ وہ بہت تیز طبیعت اور اٹل ارادے کے آدمی تھے ان میں چندر شیکھر آزاد کی سی سنجیدگی اور ٹھہراؤ نہیں تھا اس کی وجہ سے بعض وقت وہ غصہ میں کانپنے لگتے اور ایسے لوگوں کی خوب خبر لیتے جو اپنی رائے پر قائم نہ رہ پاتے۔ لیکن وہ کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔ اگر ان کی باتوں سے کسی کا دل دکھ جاتا تو وہ اس خلوص اور سچائی سے معافی مانگتے کہ کسی شخص کے بھی دل میں ان کے خلاف کسی قسم کا جذبہ پرورش نہ پا سکتا۔ محبت ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ اپنے ساتھیوں کی تکلیف دیکھ کر ان کا دل بھر آتا تھا۔ بہت صاف گو اور صاف باطن تھے۔ دل بہت کشادہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر شخص کو ان سے خاص لگاؤ تھا۔ اگر کوئی شخص ایک دفعہ بھی ان سے مل لیتا تو اسے ان سے محبت ہو جاتی۔

بھگت سنگھ کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ وہ جیل میں اپنا زیادہ تر وقت

اشتراکی ادب کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ وہ مارکس کے پیرو بن گئے تھے لیکن اپنے مطالعہ، مباحثے اور خاص طور سے بیرونی حالات مثلاً شولاپور میں مارشل لاء کے واقعہ، پشاور کے واقعہ، گڑھوالی سپاہیوں اور ان کے لیڈر چندر سنگھ کی بہادری اور حب الوطنی کے واقعات سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ مسلح سرگرمی اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جبکہ وہ عوامی تحریک کے ساتھ اس کا جزو بن کر ہو اور عوامی تحریک کی ضروریات کی پوری طرح پابند ہو۔

سوویٹ یونین سے ہم سب کو بڑی محبت تھی۔ جیل کے مطالعہ نے اس محبت میں اور اضافہ کر دیا چنانچہ ۱۹۳۰ء میں اکتوبر کے انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر ہم نے سوویٹ یونین کو پیام تہنیت بھیجا تھا۔ اس کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور اس عہد کو دہرایا تھا کہ ہم سوویٹ اسٹیٹ کی اس کے دشمنوں سے بچانے کے لئے ہر قسم کی امداد کریں گے۔

حکومت کا فیصلہ

پورے مقدمہ کے دوران ہم نے اسی پالیسی پر عمل کیا جو ہم نے شروع میں طے کی تھی یعنی اپنے نظریوں کا زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈا کیا جائے۔ ہماری اس پالیسی کی کامیابی سے اور خاص طور پر اس وجہ سے کہ اخباروں نے ہمارے مقدمہ کو اتنی شہرت دی کہ حکومت بے حد خفا تھی، حکومت ہر وقت اس کی کوشش کرتی تھی کہ ہمیں جھکا دے۔ ہم نے بھی مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کبھی حکومت کے ایسے احکام نہیں مانیں گے جن سے ہماری ذلت ہو۔ پولیس اور عدالت کے سامنے کبھی نہیں جھکیں گے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اکثر ٹکر ہو جاتی۔ پولیس سے لڑائی ہو جاتی اور مقدمہ کئی کئی روز ملتوی ہو جاتا۔

اس کا اثر یہ ہوتا کہ حکومت کے دیوالیہ پن کی اچھی طرح پول کھلتی۔ ہماری

زیادہ سے زیادہ شہرت ہوتی اور عام لوگوں کی ہمدردی ہم سے بڑھتی۔

مجسٹریٹ کے سامنے نو مہینے تک ہمارا مقدمہ چلانے کے بعد کارروائی ایک دم روک دی گئی باوجودیکہ ابھی صرف چند ہی گواہ پیش ہوئے تھے اور وائسرائے نے یہ بتلاتے ہوئے کہ "غیر معمولی حالات" پیش آ گئے ہیں اور "امن وامان" کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ایک خاص آرڈیننس نکالا جو ۱۹۳۰ء کا لاہور سازشی مقدمہ کا آرڈیننس کہلاتا ہے۔ یہ اپنی قسم کا پہلا حکم تھا۔ اس کی رو سے یہ طے کیا گیا کہ ہمارا مقدمہ ایک خاص عدالت میں چلے اور اگر وہ ضرورت سمجھے تو ہماری غیر حاضری میں بھی کارروائی جاری رکھ سکتی تھی۔ عدالت میں وکیل۔ ملزم یا ملزم کے گواہوں کا موجود رہنا کچھ ضروری نہیں تھا۔ یہ عدالت ہر قسم کی سزا حتیٰ کہ پھانسی کی سزا بھی دے سکتی تھی اور سب پر طرہ یہ کہ اس کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی تھی۔ کوئی بھی حکومت جو اپنے کو مہذب کہتی ہو اس قسم کے قانون نہیں بنا سکتی۔

حکومت کا اس سے مقصد یہ تھا کہ ہم اس مقدمہ کو اپنے انقلابی پروپیگنڈہ کے لیے استعمال نہ کر سکیں۔ ساتھ ہی غالباً ایک چیز اور انھیں پریشان کر رہی تھی وہ یہ کہ جب سانڈرس کا قتل ہوا تو وہاں ایک ہی پولیس افسر مسٹر فارن موجود تھے اور مسٹر فارن عدالت میں بھگت سنگھ کو پہچان نہیں سکے۔ اس مقدمہ کی وجہ سے سارے ملک میں جو ہمدردی کی لہر دوڑ گئی تھی اس کی وجہ سے بہت سارے سرکاری ہم گواہ حکومت کے خلاف ہو گئے تھے اور بہت ساروں کے متعلق اندیشہ تھا اور دو ساتھی جنھوں نے اقرار کر لیا تھا انھوں نے اپنا بیان واپس لے لیا تھا۔

حکومت کو خطرہ ہو گیا۔ اگر معمولی طریقہ پر مقدمہ چلا تو اسے کامیابی نہ ہوگی۔

اس خاص عدالت میں مقدمہ چل کر ابھی دو ہفتہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ توقع کے مطابق حکومت سے ٹکر ہو گئی۔ عدالت کے حاکم نے یہ حکم دیا کہ چونکہ ہم عدالت میں

داخل ہوتے وقت نعرے لگاتے ہیں. اس لئے ہمیں ہتھکڑیاں پہنائی جائیں جب ہم نے عذر کیا کہ ہم مجسٹریٹ کی عدالت میں اور ہائی کورٹ میں بھی یہ نعرے لگاتے تھے اور انھوں نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا تو اس حاکم عدالت نے پولیس کو حکم دیا کہ زبردستی کی جائے.

وکیلوں اور دوسرے بہت سارے لوگوں کے سامنے پولیس کی ایک بہت بڑی جمعیت نے لاٹھیوں اور بندوق کے کندوں سے ہم پر حملہ کر دیا. ہم لوگ نہتے تھے. لیکن ہم ڈٹے گئے. ہم دشمن کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ بہت کمزور تھے. ہمارے سر، ہاتھ اور سینے پر لاٹھیاں اور گھونسے برسنے لگے. زمین پر گرنے کے بعد بھی ہمیں ٹھوکروں اور لاٹھیوں سے مارا گیا. ہم سب زخمی ہو گئے. سارے جسم سے خون بہنے لگا اور اسی حالت میں زبردستی ہمیں عدالت کے باہر کھینچ کر لے گئے. زخم اتنے شدید آئے تھے کہ ہمارے کئی ساتھی کئی دن تک چل پھر نہیں سکے.

ہم نے مطالبہ کیا کہ حکم واپس لے لیا جائے اور اس کا یقین دلایا جائے کہ اس قسم کا برتاؤ آئندہ نہیں کیا جائے گا. حکومت اس کے لئے تیار نہیں تھی. عدالت کے اراکین میں ہندوستانی صرف آغا حیدر تھے. اس واقعہ کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے ایک بیان دیا کہ ہتھکڑیاں پہنانے یا قوت استعمال کرنے کے حکم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے. چند دن بعد عدالت کے اراکین میں تبدیلی کر دی گئی اور آغا حیدر ہٹا دیئے گئے.

اس کے بعد بغیر ملزم، بغیر ملزم کے وکیلوں اور بغیر صفائی کے گواہوں کے مقدمہ چلتا رہا اور وہ بھی ایسی عدالت میں جہاں ایک جج اس لئے ہٹا دیا گیا تھا کہ اپنی آزاد رائے رکھتا تھا اور انصاف کے اصولوں سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا. ایسی عدالت سے جس قسم کے انصاف کی توقع تھی وہ ظاہر ہے.

پانچ مہینے تک مقدمہ کا کھیل کھیلنے کے بعد اس عدالت نے اکتوبر ۱۹۳۰ء میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ ساتھ کو حبس دوام کی اور باقی کو لانبی لانبی قید کی سزائیں۔

میں ان لوگوں میں سے تھا جو بری کر دیئے گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے خلاف جس نے اقبال کیا تھا اس نے بعد میں اس کے خلاف بیان دیا۔

جیسے ہی جیل سے نکل کر سڑک پر آیا تو میں ایسے محسوس کرنے لگا جیسے میں نے اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

بھگت سنگھ کی محبت اور عزت ہمارے ملک کے لوگوں کے دلوں میں کس قدر جاگزین ہو گئی تھی اس کا پتہ مجھے باہر آ کر چلا۔ جہاں بھی کوئی جلسہ ہوتا ساری فضا "بھگت سنگھ زندہ باد" کے نعروں سے گونج جاتی۔ "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ سب سے پہلے بھگت سنگھ نے بلند کیا تھا اور اب اس نعرے نے ہر جگہ "بندے ماترم" کی جگہ لے لی تھی۔ بھگت سنگھ کا نام ملک کے ہر باسی کی زبان پر تھا۔ ان کی تصویر ہر نوجوان کے دل پر کندہ تھی۔ میرا دل فخر سے پھول اٹھتا تھا جب میں یہ سوچتا کہ اس انقلابی کے ساتھ میں نے اتنے دن گزارے ہیں۔

لوگوں کو اب بھی اتنی امید تھی کہ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا جائے گا ہر شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ کانگریس اور حکومت میں جو آج کل سمجھوتہ کی بات چیت ہو رہی ہے اس میں ایک شرط یہ بھی ضرور ہو گی کہ ان بہادروں کو رہا کر دیا جائے تو کم از کم موت کی سزا کو قید کی سزا سے بدل دیا جائے۔ یہ امید غلط ثابت ہوئی ہم تشدد کے مجرم تھے۔ اس لئے کانگریس اسے گاندھی ارون سمجھوتہ کی ایک شرط نہیں بنا سکتی تھی اگرچہ وہ چاہتی تھی کہ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی جان بچا لی جائے۔

اپریل ۱۹۳۱ء میں اسی زمانہ میں جبکہ کراچی میں کانگریس کا اجلاس

رہا تھا بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو شہادت کا جام پلایا گیا۔ اس وقت بھگت سنگھ مشکل سے چوبیس سال کے تھے۔

میں اس وقت کراچی جا رہا تھا۔ جو شخص بھی خبر سنتا بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رہتا۔ مجھے تو اتنا دھچکا لگا کر بالکل ساکن ہو گیا۔ مجھے کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا۔

شہاب ثاقب کی طرح سیاسی فضا میں یہ شہید چمکا اور غائب ہو گیا اس کی قربانی نے لاکھوں انسانوں کے دل منور کر دیئے۔ وہ نئے ہندوستان کا مظہر بن گیا۔ اس نے یہ مثال چھوڑ دی کہ کس طرح موت کے سامنے سینہ سپر ہونا چاہیئے۔ سامراجی طاقت کے مقابلہ کے لئے کس قدر قوت ارادی چاہیئے اور اسی کے بل پر سامراج کے لشکر پر ہم اپنے دیش میں عوام کی حکومت قائم کر سکتے ہیں۔

○

چندر شیکھر آزاد

۱۹۳۰ء کی انقلابی تحریک میں جو نوجوان شریک ہوئے ان کے لئے چندر شیکھر آزاد کا نام ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی ذات نوجوانوں کو گرماتی اور متحرک کیا کرتی تھی۔

وہ ۱۹۲۵ء کے کاکوری کے ریل کے واقعہ میں شریک تھے لیکن وہ پولیس کے ہاتھ نہیں لگ سکے۔ پولیس ان کے پیچھے سرگرداں تھی۔ وہ اگر کہیں اس کے ہاتھ لگ جاتے تو پھانسی کے تختہ کے سوا ان کے لئے کوئی دوسری جگہ نہ ہوتی لیکن اس کے باوجود وہ ایک دن بھی خاموش نہ بیٹھ سکے۔ انھیں پارٹی کو منظم کرنے کا بڑا ملکہ تھا چنانچہ کاکوری کی گرفتاریوں کے بعد وہ بھگت سنگھ اور سکھدیو کے ساتھ پارٹی کی نئے سرے سے تنظیم کرنے لگے۔

بہت ساری چیزوں میں وہ بھگت سنگھ سے بالکل مختلف تھے۔ بہت خاموش اور بالکل پرسکون رہتے۔ خاص طور پر جب کوئی مسلح کارروائی رہبری کرتے ہوں پریشانی کبھی چھو نہ جاتی۔ ان کے اعصاب گویا فولاد کے بنے ہوئے تھے ان میں بھگت سنگھ کی سی وسعت نظر اور ذہنی اور علمی قابلیت نہیں تھی۔ انھیں چونکہ پڑھنے لکھنے کا موقعہ کم ملا تھا اس لئے نئے نئے خیالات جو اس زمانہ میں ہماری پارٹی میں داخل ہو رہے تھے جذب کرنے میں انھیں ذرا دقت ہوتی تھی۔ جب

نے اپنی پارٹی کا نام بدل کر ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسیشن رکھا تو انھوں نے سے منظور کر لیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے نزدیک ان سب چیزوں کی کچھ اس قدر زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ وہ عمل کے پجاری تھے اور انھیں نظریہ سے زیادہ کام سے دلچسپی تھی۔ ان کا ایسا بہادر آدمی اس دھرتی نے شاید ہی پیدا کیا ہو۔ کسی مسلح کارروائی کے لئے جس قابلیت سے وہ انتظام کرتے تھے اور جس طرح واقعوں پر وہ قابو حاصل کرتے تھے۔ وہ کسی دوسرے انسان کے بس کی چیز نہیں تھی۔

وہ توانا تھے۔ اعصاب فولادی تھے اور ان میں غیر معمولی قوت اور پھرتی تھی۔ ان سب کے ساتھ وہ ہم میں سب سے اچھے نشانہ باز تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پنجاب، یو۔پی اور بہار جہاں وہ کام کرتے تھے ان کے نام سے پولیس کے افسروں میں تھرتھری چھوٹ جاتی تھی۔ کسی آدمی سے حتیٰ کہ بھگت سنگھ سے بھی اتنی دہشت پولیس والوں کو نہیں تھی۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ایک خون کے پیاسے وحشی انسان تھے۔ جیسا کہ پولیس افسران کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ان میں بڑی خوبیاں تھیں۔ ہمیشہ ہنستے رہتے ہر وقت مذاق کرتے رہتے۔ اپنے ساتھیوں کو ہنساتے ان کی ہر مشکل اور ہر ضرورت کا خیال رکھتے اور ان کی مدد کرتے۔ جو بھی انھیں جانتا تھا نہ صرف ان کی عزت کرتا تھا بلکہ محبت کرتا تھا۔ البتہ وہ نظم و ضبط میں بہت ہی سخت تھے اگر کوئی اپنا فرض پورا نہ کرتا تو اسی سختی سے اس کی خبر بھی لیتے لیکن وہ کبھی کسی سے ناانصافی نہ کرتے۔

ان کی ذات میں لوگوں کو اتنا اعتماد اور بھروسہ تھا کہ جس کارروائی میں آزاد شریک ہوتے تو ہر شخص کو یقین رہتا کہ اس میں کبھی ناکامی نہیں ہو سکتی۔

ہماری گرفتاری کے بعد پولیس نے ان کے کھوج لگانے کی بہت کوشش کی۔ مگر جس طرح کاکوری والے واقعہ کے سلسلے میں اسے ناکامی ہوئی اسی طرح اس مرتبہ بھی وہ پولیس کے ہاتھ نہ لگ سکے انھوں نے بچھڑے ہوئے ساتھیوں کو پھر سے اکٹھا کیا اور پھر نئے سرے سے پارٹی کی تنظیم شروع کی اور چند ہی روز بعد دسمبر ۱۹۲۹ء میں وائسرائے کی اسپیشل ٹرین پر بم گرا اور وہ بال بال بچ گیا۔ پولیس نے محسوس کیا کہ جب تک چندر شیکھر آزاد، آزاد ہے، تب تک ان کے لئے چین میسر نہیں ہے۔ انھوں نے ہر طرف اس کے لئے جال پھیلا دیئے مگر یہ شیر دل ان میں سے بھی نکل بھاگا اور لاہور پہنچ گیا اور یہاں آکر عدالت سے ہم کو چھڑا کر لے بھاگنے کا خاکہ بنایا، اور اس میں انھیں یقینی کامیابی ہو جاتی۔ لیکن بم وقت سے پہلے پھٹ گیا۔ اس وقت آزاد گرفتار ہونے سے بال بال بچ گئے اور اس کے بعد پولیس کو خبر ملی کہ وہ دہلی پہنچ گئے وہاں کسی مسلح کارروائی کی رہبری کر رہے ہیں۔

اس کے بعد پنجاب کے کئی ضلعوں میں بم پھٹنے کے مسلسل کئی واقعات ہوئے کئی پولیس کے افسر مارے گئے یا زخمی ہوئے اور اسی کے ساتھ دہلی اور پنجاب میں گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ سینکڑوں آدمی گرفتار کئے گئے۔ اسی زمانہ میں دوسرے لاہور سازش کے مقدمہ کے لوگ گرفتار ہوئے۔ اس مرتبہ بھی آزاد صاف بچ کر نکل گئے حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں کی ساری پولیس ان کے تعاقب میں تھی ہزاروں روپئے کے انعامات ان کی گرفتاری کے لئے رکھے گئے تھے۔ مگر وہ جاں باز کسی کے ہاتھ نہیں لگ اس زمانہ میں حالات انتہائی نازک ہو گئے تھے سینکڑوں ساتھی جیل میں تھے۔ پولیس نے سخت دہشت پھیلا رکھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس شیر دل کی ہمت کوئی نہ توڑ سکا اور وہ پارٹی کی تنظیم میں پھر مصروف ہو گیا۔

اپنی رہائی کے بعد میں ۳۰ء میں ملاقوان کے عزم و ارادے کو دیکھ کر حیرا

رہ گیا۔ ان میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔ انقلابی سرگرمیوں میں مسلسل مصروفیتوں کے باوجود اب وہ مطالعہ پر بھی گہری توجہ کرنے لگے تھے۔ ان کے خیالات میں ٹھہراؤ اور سنجیدگی آنے لگی تھی۔ ان کی انگریزی کی تعلیم بہت معمولی تھی، اس لئے وہ کتابیں دوسروں سے پڑھوا کر سمجھتے تھے۔ ان کے دل میں سوویٹ یونین کی بہت محبت پیدا ہوگئی تھی اور وہ چند ساتھیوں کو وہاں بھیجکر تعلیم دلوانا چاہتے تھے

اتنی شکستوں کے باوجود ان کی ہمت اسی طرح قائم تھی۔ اسی زمانہ میں یہ خبر عام تھی کہ کانگرس اور حکومت میں سمجھوتہ ہونے والا ہے اور آزاد اور پارٹی کے دوسرے لوگ جانتے تھے کہ حالات اس طرح نہیں بدل رہے ہیں جس طرح کہ انھیں اُمید تھی ان کی اور ان کے ساتھیوں کی غیر معمولی قربانیوں اور سامراجی قوتوں پر اتنی ضربیں لگانے کے باوجود قومی تحریک انقلاب کی شکل اختیار نہ کر سکی۔ پشاور، شولاپور اور چٹاگانگ کے واقعات سے بھی جو اُمید بندھی تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔

ان سب چیزوں نے آزاد کو اس پر مجبور کیا کہ حالات پر زیادہ سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ غور کیا جائے۔ یہ بات نہیں تھی کہ دہشت پسندی پر سے اب ان کا ایمان اُٹھ گیا تھا لیکن یہ بات ظاہر تھی کہ اس نظریہ میں کہ چند نوجوانوں کی بہادری اور قربانی سے قومی تحریک کو متاثر کیا جا سکتا ہے اور اسے انقلاب کے راستہ پر لگایا جا سکتا ہے۔ کچھ خامی ضرور تھی۔ ان کو یہ معلوم کرنے کا بڑا اشتیاق تھا کہ اس کے متعلق بھگت سنگھ کا کیا خیال تھا جیل میں ہم نے اس مسئلہ پر کیا غور کیا اور کس نتیجہ پر پہنچے۔

آزاد کا اپنا خیال یہ تھا کہ اب جس قدر بھی ہو سکے۔ نوجوان عوامی تحریکوں میں جائیں۔ مزدوروں اور کسانوں کو منظم کر کے ایک بڑی اشتراکی تحریک چلائیں اور انھیں اور ان کے چند ساتھیوں کو اس کام پر رہنے دیا جائے کہ جب ضرورت ہو

مسلح کارروائی کریں اور انقلاب کے لئے نوجوانوں کو تیار کریں تاکہ اس وقت مسلح سپاہی کافی تعداد میں میسر آسکیں۔

اس دنیا وہ اب آزاد پارٹی کی تنظیم کرنا چاہتے تھے لیکن انھیں اس کا موقع نہیں ملا۔ پارٹی کے ایک غدار نے پولیس کو اطلاع دے دی کہ وہ الٰہ آباد میں ہیں اور پولیس نے انھیں الفریڈ پارک میں اچانک گھیر لیا۔ پولیس میں اور ان میں بڑی دیر تک لڑائی ہوتی رہی۔ دو پولیس افسر گھائل ہوئے اور انھیں پولیس کی ایک گولی ایسی لگی کہ اس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اس طرح ہندوستان کے ایک بہادر سپوت کی زندگی ختم ہو گئی۔ ان کی بہادری اور قربانی کی داستانیں شمالی ہندوستان کے لوگ کبھی نہ بھلا سکیں گے۔

دوسرے ساتھی

بھگت سنگھ کے ساتھیوں کو لاہور سازش کے مقدمہ میں کالے پانی کی سزا ہوئی تھی اور یہ انڈیمان بھیج دیئے گئے تھے۔ ان میں سے مہابیر سنگھ انڈیمان کی پہلی بھوک ہڑتال میں شہید ہو گئے اور کشوری لال جنے دیو، شیو ورما اور گیا پرشاد ۱۶ سال کی قید کاٹنے کے بعد ابھی رہا ہوئے ہیں۔

ان کی قید کا پورا زمانہ سخت جد و جہد اور بھوک ہڑتالوں میں گذرا۔ جیل میں ان لوگوں نے بڑا گہرا مطالعہ کیا اور آخر کار کمیونزم کے حامی بن گئے اور آج کمیونسٹ پارٹی کے جھنڈے کے نیچے ملک کی آزادی کی جنگ میں پھر سب سے آگے آ گئے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن پر ہمارا ملک ہمیشہ فخر کرے گا۔ یہ ابھی لڑکے ہی تھے کہ اپنی مسرتوں، اپنی امیدوں اور آرزوؤں کو ملک کی آزادی کی لڑائی کی بھینٹ چڑھا دیا۔

ان لوگوں میں جوانی کا گرم خون موجزن تھا۔ اپنے ملک سے غیر معمولی محبت تھی اور اسے سامراجی غلامی سے آزاد کرانے کا جذبہ تھا۔ دوسری طرف ملک میں بے بسی اور جمود کا دور دورہ تھا۔ ان حالات میں انھیں ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ یہ کہ مسلح کارروائی کی جائے۔ مسلح انقلابیوں کی جانبازی اور ایثار سے اپنے ملک کے لئے پھانسی کے تختوں پر جان دینے سے سارے ملک میں ایک ہیجان پیدا ہو جائے گا۔ سارے ملک کے لوگ اپنے ظالم حاکموں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

اس جرم کی انھیں کافی سزا بھگتنی پڑی۔ وہ نوجوان جنھوں نے ابھی زندگی کی بہار بھی نہیں دیکھی تھی۔ ابھی تو جن کی زندگی شروع ہوئی تھی۔ انھیں انڈیمان اور ہندوستان کی کال کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا اور تقریباً سولہ سال بعد اب انھیں رہا کیا گیا۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جن کا یہ جرم بھی ثابت نہیں کیا جا سکا کہ انھوں نے کسی مسلح کارروائی میں حصہ لیا تھا۔ ان کے خلاف مقدمہ ایک بالکل مضحکہ خیز کر رہ گیا تھا۔ پوری کارروائی میں نہ تو وہ خود موجود تھے۔ نہ ان کے وکیل اور نہ ان کے صفائی کے گواہ۔ ان کا "جرم" صرف ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ وہ سامراجی غداؤں کے سامنے گھٹنے کیوں نہیں ٹیک دیتے۔ لیکن ۱۶ سال کی دوزخ بھی ان کی قوت ارادی کو توڑ نہ سکی۔ وہ بیمار ہو گئے ایک دو دق میں مبتلا ہو گئے۔ ان پر بڑھاپا آ گیا۔ لیکن ان کی ہمت اسی طرح جوان رہی۔

کشوری لال

میں کشوری لال سے پہلی مرتبہ لاہور سازش کے سلسلہ میں گرفتاری کے بعد ملا۔ وہ غالباً جولائی ۱۹۲۹ء کا زمانہ تھا۔ تمام قیدی جیل کے دروازہ پر عدالت جانے کے لئے جمع کیے گئے تھے۔ ہم لوگ بہت افسردہ خاطر تھے۔ اس لئے نہیں کہ ہمیں لانبی سزاؤں کا ڈر تھا بلکہ اس لئے کہ ہماری پارٹی کو بڑا دھکا لگا تھا۔ دروازہ پر کشوری سے ملاقات ہوئی۔ یہ چھوٹے قد کا مضبوط نوجوان جس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ ان کی یہ مسکراہٹ ان سنجیدہ حالات میں بے اوقع معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن بڑی سے بڑی مصیبت کے وقت بھی وہ ان کے ہونٹوں سے جدا نہیں ہوئی۔ چاہے کسی قسم کا واقعہ ہو جائے۔ کوئی مصیبت کیوں نہ پیش آ جائے ہر چیز میں وہ ہنسنے ہنسانے کی کوئی بات نکال لیتے تھے اور اس بات سے خود ہی لطف نہ اٹھاتے تھے بلکہ ہم سب کو سنا کر ہنساتے ہنساتے

ہنسا دیتے۔ ہماری بھوک ہڑتال اور جدوجہد کے تاریک ترین زمانے میں بھی ان کی فقرہ بازی اور مذاق اسی طرح جاری رہے۔

عدالت میں بیٹھے انھیں کسی وکیل یا مجسٹریٹ کی شکل میں کوئی مضحکہ خیز بات ضرور نظر آنے لگتی اور وہ اسے دوسروں کو سناتے۔ ایک قہقہہ بلند ہو جاتا۔ سب لوگ حیران ہو کر دیکھنے لگتے۔ عدالت کی کارروائی رک جاتی۔ وکیل ہمارا یہ غیر مناسب طرزِ عمل دیکھ کر پریشان ہو جاتے۔ ہم خورد کشوری کی اس حرکت پر خفگی کا اظہار کرتے اور وہ پھر اپنا چہرہ اس طرح لٹکا لیتے اور ایسی غمگین صورت بنا لیتے کہ پھر ایک قہقہہ پڑ جاتا۔

وہ ہم میں سے کسی کو بھی نہ بخشتے۔ ہر شخص ان کی فقرہ بازی کا نشانہ بنتا مگر اس میں کسی بدطینتی کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔ جس کی وجہ سے وہ جس کا مذاق اڑاتے وہ سب سے زیادہ لطف لیتا۔

اس مسکراتے ہوئے انسان کے اندر فولاد کا دل تھا لیکن ساتھ ہی اس میں بڑی ہمدردی اور محبت بھی تھی۔ لاہور جیل میں ان پر ایسے وحشیانہ مظالم کیے گئے کہ اس کا جواب مشکل سے ملے گا۔ پولیس چاہتی تھی کہ وہ پارٹی کے تمام راز ظاہر کر دیں مگر پولیس کو بھی معلوم ہو گیا کہ اسے کیسے آدمی کا سامنا ہے۔ وہ اس پر مصیبتوں کا پہاڑ توڑ دیتے وہ مسکراتا رہتا۔

جون ۱۹۳۰ء کے ایک واقعہ کا تذکرہ یہاں بے موقع نہ ہوگا۔ اس زمانہ میں سول نافرمانی کی تحریک زوروں پر تھی ہمارا جیل کا بلاک قیدیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں سے اکثر نوجوان تھے۔ ہم لوگ ظاہر ہے کہ ان سے بالکل الگ تھلگ رکھے گئے تھے۔ جیل افسر اس پر خاص طور سے نگرانی کرتے کہ ان سے اور ہم سے کسی قسم کا ربط نہ قائم ہونے پائے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ان میں سے اکثر کو پیٹا جاتا ہے اور سخت

تکلیفیں دی جاتی ہیں. ہم اکثر اس پر بحث کرتے اور سوچتے کہ ان کی کس طرح مدد کی جائے لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی. ہمارے وارڈ اور چوکیدار ایسے رکھے جاتے کہ ہمیں کوئی بات معلوم نہ ہوتی اور اگر معلوم بھی ہوتی تو کئی روز بعد. کوئی کارروائی کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ہمیں صحیح اطلاع ملے اور وقت پر ملے.

کشوری نے ہمت نہیں ہاری. انھیں لوگوں سے دوستی پیدا کرنے اور ان سے کام نکالنے کا بڑا ملکہ حاصل تھا. انھوں نے یہ اطلاع حاصل کی کہ اسی دن ایک کانگریسی نوجوان کو بری طرح پیٹا گیا ہے اور اسے بیڑیاں پہنا دی گئی ہیں ہم نے ایک میٹنگ کی. ہم جانتے تھے کہ محض سپرنٹنڈنٹ سے باتیں کرنے سے کام نہیں چلے گا اس لئے وہ اس واقعہ ہی سے انکار کر دے گا. کچھ اور کرنے کی ضرورت تھی لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کیا جائے.

کشوری نے فوراً ایک تجویز پیش کی. سیڑھی لگا کر اپنی دیوار پر ہم سب چڑھ جائیں اور اس کانگریسی قیدی کے کمرے میں جائیں جو بھی راستہ میں آتے اسے دھکا دے کر ہٹا دیں اور وہاں اس وقت تک نعرے لگاتے رہیں جب تک سپرنٹنڈنٹ وہاں نہ آجائے. اس کے بعد ہم اس کو بتلا سکتے ہیں کہ اسے اس طرح پیٹنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اسے فوراً اس چیز کو بند کر دینا چاہیئے. یہ بڑا جرأت اور خطرہ کا کام تھا لیکن ہم نے طے کیا کہ اسے آزمایا جائے.

ہم نے جیسا سوچا تھا ویسا ہی ہوا. وارڈ اس کے لئے تیار تو تھے نہیں اس لئے وہ ہماری کوئی مزاحمت نہ کر سکے اور چند منٹ میں ہم وہاں پہنچ گئے. اس کانگریسی قیدی سے ملے اور جو واقعات ہم جاننا چاہتے تھے. وہ ہم نے معلوم کر لئے.

اس وقت تک ہر جگہ خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو چکی تھیں. ہر جگہ یہ بات پھیل چکی تھی کہ بم کے مقدمہ کے قیدیوں نے بغاوت کر دی ہے جیلر وارڈوں

کی ایک فوج لے کر وہاں پہنچ گیا اور ہم پر بندوق کے کندوں سے حملہ کیا گیا۔ ہم نے بھی اس کا جواب دیا لیکن ہم ایک تو نہتے تھے۔ دوسرے ہماری تعداد ان کے مقابلہ میں بہت کم تھی ہم لوگوں کو بہت زخم آئے۔ خاص طور پر کشوری کے سخت چوٹیں آئیں۔ بعد میں یہ سوچ کر کہ جیل کے تمام سیاسی قیدی بغاوت کر دیں گے۔ سپرنٹنڈنٹ نے لڑائی رکوا دی۔

ایک گھنٹہ بعد سپرنٹنڈنٹ ہم سے آکر ملا اور کہا کہ ہمیں اس طرح قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لے لینا چاہیے اور اس کا وعدہ کیا کہ وہ تحقیقات کرے گا اور احکام جاری کر دے گا کہ کسی کو نہ پیٹا جائے۔ وہ اس وعدہ پر بہت دن قائم نہیں رہا لیکن کم از کم وقتی طور پر حالات بہتر ہو گئے کشوری اس دن کا ہیرو تھا۔

کشوری کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ آج تک ان میں وہی جت ہے۔ چہرے پر اسی طرح مسکراہٹ کھیلتی ہے۔ جس مسکراہٹ نے انھیں ہم سب میں اتنا مقبول بنا دیا تھا۔ انھوں نے جیل میں کافی مطالعہ کیا اور کمیونزم کی راہ پر آ گئے۔ یہی وجہ تھی کہ سامراجی حکومت ان سے اتنی نفرت کرتی تھی۔ نوکرشاہی اور پنجاب کے زمینداروں اور اناج چوروں کی حکومت جانتی تھی کہ پنجاب کے کسانوں میں کمیونزم کی تحریک کس طرح پھیل رہی ہے اور لال جھنڈے کے نیچے منظم ہو کر کسان ایک دن اس کا خاتمہ کر دیں گے۔ اس لیے کشوری کو اس وقت تک رہائی نہ مل سکی۔ جب تک حالات نے نوکرشاہی کو اس پر مجبور نہ کر دیا۔

شیو ورما

لاہور سازش کے قیدیوں میں شیو ورما سب سے سنجیدہ تھے۔ وہ سب سے زیادہ پڑھتے اور بیرونی حالات اور انقلابی تحریک پر کافی غور و خوض کرتے تھے ہم سب جانتے تھے کہ ہمیں کم سے کم جو سزا ملے گی وہ کالے پانی کی سزا ہوگی اور خیال

تھا کہ انھیں تو شاید سب سے بڑی سزا ملے اس لئے کہ وہ مرکزی کمیٹی کے رکن تھے اور یو پی میں پارٹی کے آرگنائیزر تھے۔ ہمیں شروع ہی میں اس کی ہوا مل گئی تھی کہ شاید حکومت اس کا مطالبہ کرے کم از کم مرکزی کمیٹی کے تمام ممبروں کو پھانسی کی سزا دی جائے۔ ان کا اس قدر مطالعہ میں معروف رہنا ہمیں بے موقع معلوم ہوتا تھا اس لئے ہم اکثر اس پر مذاق اڑایا کرتے تھے۔ مطالعہ کے علاوہ ایک اور چیز جس میں انھیں بڑی دلچسپی تھی وہ شطرنج تھی۔ وہ کھیلتے بھی بہت اچھا تھے۔

میں شیو سے مقدمہ کے پہلے بھی کئی مرتبہ ملا تھا لیکن پارٹی کے اصول کے مطابق میں نے ان سے کبھی یہ نہ پوچھا کہ وہ کون ہیں کہاں کے ہیں۔ اگرچہ کئی مرتبہ میرا جی بہت چاہا۔ وہ اس زمانہ میں دبلے پتلے نازک سے تھے۔ بال وقت سے پہلے ہی سفید ہو چلے تھے۔ باتیں آہستہ آہستہ تول تول کے کرتے کبھی جوش میں نہ آتے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ہمارے گروہ کے لئے بالکل غیر موزوں تھے اور مشکل سے اس پر یقین آتا کہ وہ ہماری "بم اور ریوالور" کی پارٹی کے سب سے سرگرم رکن تھے۔

وہ یو۔ پی کے ایک ضلع ہردوئی میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور سیاسی زندگی میں پندرہ سال کی ہی عمر میں آ گئے تھے۔ وہ اپنی تعلیم چھوڑ کر سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہوئے اور بدیشی کپڑوں کے بائیکاٹ کی تحریک میں کافی حصہ لیا۔ تحریک ختم ہونے کے بعد انھوں نے پھر تعلیم شروع کر دی اور ساتھ ہی سوشل کام بھی کرتے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں کانپور آ گئے اور ہماری خفیہ تحریک میں شریک ہو گئے ان کے کام کا طریقہ ایسا تھا کہ ایک ہی سال میں ان کا کالج ہماری تحریک کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔

۱۹۲۵ء کے کاکوری کے مقدمہ میں تمام پرانے لیڈر گرفتار ہو گئے اور سارا کام نئے نوجوانوں کے کاندھوں پر پڑ گیا۔ ان میں سے اکثر نے تو پستول چھوا تک نہیں تھا

سب کے سب ناتجربہ کار تھے۔ نہ پیسہ تھا نہ دوسرے وسائل تھے۔ ساتھی بہت کم رہ گئے تھے۔ کاکوری کے واقعہ کے بعد ہمدرد اور دوست دور بھاگنے لگے تھے۔ ان حالات میں پارٹی کو نئے سرے سے منظم کرنا تھا۔

کاکوری کی گرفتاریوں سے دہشت پسندی کے بارے عقیدے پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بلکہ اس کے برعکس ہم سمجھنے لگے کہ عوام کو متحرک کرنے کے لیے حکومت کے خلاف مسلح اقدام کی اور سخت ضرورت ہے۔ ساتھ ہی روسی انقلاب کی کامیابی، اشتراکی نظام کی کامیابی اور ہندوستان میں بڑھتی ہوئی مزدور تحریک بھی ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ہمیں اشتراکیت پر جو بھی کتابیں مل جاتیں وہ ہم پڑھتے اور اس پر بحث و مباحثہ کرتے کہ انگریزوں کو نکالنے کے بعد ان کی جگہ کس قسم کی حکومت قائم کی جائے گی۔

ایک طرف تو ہم اشتراکیت کی طرف جا رہے تھے۔ دوسری طرف ہمیں اس پر بھی عقیدہ تھا کہ ایسے نوجوانوں کا منظم اور مسلح دستہ جو ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو انقلاب کے لئے مفید ہو گا۔ ان دونوں خیالات کا نتیجہ یہ تھا کہ ہماری پارٹی کا نام ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ اس نئی تبدیلی میں شیو کا بڑا حصہ تھا۔ اس لئے کہ نئے خیالات کا ان پر سب سے زیادہ اثر تھا۔

وہ اپنی تعلیم ترک کر کے انقلابی تحریک میں آئے اور جب ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن ہوئے اور یوپی کے چیف آرگنائیزر مقرر ہوئے تو پھر انھوں نے ہر ضلع کا دورہ کیا۔ پرانے مرکزوں کو مضبوط کیا اور نئے مرکز قائم کئے۔

وہ مئی ۱۹۲۹ء میں قید ہوئے اور ابھی کچھ دن ہوئے کہ رہا ہوئے۔

۶۳ دن کی مشہور بھوک ہڑتال میں شیو کی حالت سب سے پہلے خراب

ہوئی تھی خیال تھا کہ سب سے پہلے وہی موت کا شکار ہو جائیں گے۔ ہڑتال کے پندرہ روز بعد ان کی حالت بیحد خراب ہو گئی تھی بیہوشی اور بخار کی حالت میں انھیں ہسپتال منتقل کیا گیا تھا۔ انھیں نمونیا ہو گیا تھا۔

ان کے سینے میں سخت درد تھا جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ بستر میں تڑپتے رہے۔ کسی وقت نیند آتی اور نہ سکون ڈاکٹر التجا کرتے کہ دوا پی لیں یا کم از کم نیند کے لئے کوئی دوا استعمال کر لیں لیکن وہ ہمیشہ انکار کر دیتے۔ وہ آہستہ سے جواب دیتے۔ "ہم نے طے کیا ہے کہ ہم کوئی دوا استعمال نہیں کریں گے اور میں اس فیصلہ کے خلاف نہیں جاؤں گا!" وہ اس سے کیسے بچ گئے یہ ایک معجزہ ہے۔

اس کے بعد کی ہر کشمکش میں انھوں نے اسی ہمت کا اظہار کیا۔ عدالت میں پولیس سے ٹکر میں ایک دن پولیس نے انھیں اتنا مارا کہ وہ بیہوش ہو گئے۔ لیکن کوئی چیز ان کی ہمت کو توڑ نہ سکی۔

وہ اپنی ذہانت کا لوہا ہر جگہ منوا دیتے تھے۔ ہم میں سے اکثر کے برعکس وہ عدالت کی کارروائی بہت غور سے سنتے تھے اور اس کے بعد سرکاری گواہوں پر اتنی سخت جرح کرتے کہ وہ بار بار خود اپنے بیانات کی تردید کرنے لگتے اور عدالت میں ایک قہقہہ بلند ہو جاتا۔

شیو کو اس مقدمہ میں کالے پانی کی سزا ملی۔

بھوک ہڑتال کے بعد حکومت نے ہم سے چند وعدے کئے تھے لیکن چند ہی روز کے بعد وہ اس سے پھر گئی۔ اس سے بڑھ کر بے شرمی کی مثال کم ہی ملے گی۔ لاہور سازش کے تمام قیدیوں کو سی کلاس میں رکھا گیا اور ان سے نہایت بیہودہ برتاؤ کیا گیا چنانچہ شیو اور جئے دیو صوبہ مدراس کے راج مندری جیل میں منتقل کئے گئے تو انھیں پانچ مہینے تک بھوک ہڑتال کرنا پڑی اور اس کے بعد وہ انڈیمان منتقل کر دئے

گئے۔ وہاں پر کشمکش شروع ہوگئی اور پھر کہیں ۱۹۳۲ء میں وہاں بڑی بھوک ہڑتال ہوئی اور ہندوستان میں اس کے متعلق سخت ہیجان ہوا تو پھر ہندوستان واپس آئے۔

شیو جب انڈمان میں تھے تب ہی وہ کمیونسٹ پارٹی میں آگئے تھے۔ اور تب سے اس کے سرگرم رکن ہیں۔ جب فاشسٹ ہمارے دروازے تک پہنچ گئے تھے تو جئے دیو گپتا پرشاد اور شیو ورما نے ملک والوں سے اپیل کی تھی کہ متحد ہو کر قومی حکومت حاصل کریں اور حملہ آوروں کو مار بھگائیں۔

جئے دیو

جئے دیو اسی ضلع کے رہنے والے ہیں جس ضلع کے شیو ورما ہیں۔ وہ شیو سے تین سال چھوٹے ہیں۔ لیکن دونوں بچپن کے دوست ہیں۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی دونوں کی دوستی بھی بڑھتی گئی۔ جب ایک کا ذکر کیجئے تو دوسرے کا ذکر خود بخود ہونے لگتا ہے۔ اکثر چیزوں میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جئے دیو اونچے پورے۔ ورزشی جسم کے۔ کھیل کے بیحد شوقین تھے اور ان کے مقابلہ میں شیو۔ دُبلے پتلے۔ سنجیدہ اور پڑھنے کے شوقین۔ ایک چیز دونوں میں ضرور مشترک ہے وہ یہ کہ دونوں کے دلوں میں وطن کی اور عام انسانوں کی محبت کی آگ روشن ہے یہی محبت انھیں سول نافرمانی کی تحریک میں لائی اور اسی کی وجہ سے وہ اپنے ضلع میں ہوشیل کام کرتے رہے۔

جئے دیو ۱۹۲۵ء میں ڈی۔اے۔وی کالج کانپور میں شریک ہوئے۔ اور دہشت پسند پارٹی کے سرگرم رکن بن گئے۔ ہندوستان اور دوسرے ممالک کے خیالات نے انھیں بھی اشتراکیت کے قریب کر دیا۔ لیکن انھوں نے یہیں بس نہیں کر دیا بلکہ وہ لکھنؤ اور ہردوئی کے کسانوں میں جا کر کام کرنے لگے تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے کسانوں اور خاص طور سے اچھوتوں کے حالات معلوم کریں۔ جنھیں حکومت نے

"پیشہ ور مجرم" قرار دے دیا تھا۔ انھوں نے جب اپنی آنکھوں سے ان کی پسماندگی، غربت اور تباہ حالی کا نقشہ دیکھا تو ان کے خیالات میں اور پختگی آگئی اور انھوں نے محسوس کیا کہ ملک کے لئے کسی قسم کی تبدیلی مفید نہیں ہو سکتی، جب تک کہ حقیقی معنوں میں عوام کا راج قائم نہ ہو۔ اور ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ نہ کیا جائے کچھ دنوں تک وہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں انقلابی کام کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے تعلیم ترک کر دی اور کل وقتی کارکن بن گئے۔ مئی ۱۹۲۹ء میں وہ شیو اور گیا پرشاد کے ساتھ سہارن پور میں گرفتار ہو گئے۔ جہاں انھوں نے ایک بم فیکٹری قائم کر رکھی تھی۔

مقدمہ کے زمانہ کی ہماری ہر کشمکش میں جے دیو نے نمایاں حصہ لیا۔ جب کسی عمل کا سوال آتا تو سب سے پہلے اس کی تائید کرتے۔ خواہ وہ بھوک ہڑتال ہو، پولیس سے ٹکر ہو یا سیاسی قیدیوں کی ہمدردی میں کوئی مظاہرہ ہو۔ ایک مرتبہ جب کسی بات کے متعلق تصفیہ کر لیا جاتا تو پھر وہ اصرار کرتے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اگر اس سلسلہ میں سمجھوتہ کی کوئی بات کرتا تو وہ اس کی سخت مخالفت کرتے۔

ہمارا مقدمہ جب مجسٹریٹ کی عدالت میں چل رہا تھا تو ایک دن ہمارے سب سے کم عمر ساتھی پریم دت نے جے گوپال نامی ایک گواہ پر جوتا پھینک مارا۔ جے گوپال پہلے ہمارا ساتھی تھا اور اب اس نے اقبال کر لیا تھا۔ جوتا مارنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کا بیان نہایت اشتعال انگیز تھا اور وہ ہماری پارٹی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ حرکت محض وقتی اشتعال کی وجہ سے ہو گئی تھی۔ اگرچہ جے گوپال کا جوتا نہیں لگا مگر عدالت نے حکم دیا کہ جب تک مقدمہ چلتا رہے ہمیں ہتھکڑیوں میں رکھا جائے۔ اس ایک دن کے لئے عدالت برخاست کر دی گئی۔ دوسرے دن جب ہم جیل کے دروازہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہمیں ہتھکڑی پہنائی جائے گی۔ جب ہم نے اس سے انکار کیا تو پولیس

بے منتع جماعت نے یکایک ہم پر حملہ کر دیا۔ جیل کے صحن میں باقاعدہ لڑائی چھڑ گئی پر کنٹرول نا تھا۔ بجوئے، سنہا اور راج کمار دو سخت زخمی ہوئے۔ ایک گھنٹہ کی لڑائی کے بعد ہمیں سے صرف پانچ آدمیوں کو پولیس جیل کی گاڑی میں بٹھا سکی۔

دوسرے دن ہم تک یہ بات پہنچائی گئی کہ اگر ہم عدالت میں ہتھکڑیاں پہن کر نے پر رضامندی کا اظہار کریں تو ہتھکڑیاں نکال دی جائیں گی اور حکم واپس لے لیا جائے گا۔ ہماری پارٹی میں یہ مسئلہ پیش ہوا تو اس پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی کہ کیا کرنا چاہیے۔ جنے دیونے ہر قسم کے سمجھوتے کی مخالفت کی اور میں نے اور کشوری نسان کی تائید کی لیکن ہم اقلیت میں تھے۔ بشیلا اور بجوئے کے استدلال میں بھی وزن تھا۔ انھوں نے کہا۔ "کل جیل میں جو کچھ ہوا اس کے متعلق باہر کوئی کچھ نہیں جانتا۔ غیر مسلح قیدیوں پر لاٹھی چارج چونکہ جیل کے اندر ہوا اس لیے اس کے متعلق اخباروں میں کوئی رپورٹ نہیں چھپی۔ اگر مجسٹریٹ ہتھکڑیاں نکالنے سے انکار کرے تو ہم پھر لڑ سکتے ہیں اور اب کی لڑائی عدالت میں ہوگی اور لوگوں کو معلوم ہوگا کہ قانون کے نام پر کس قدر وحشیانہ سلوک ہمارے ساتھ کیا جاتا ہے۔" استدلال میں وزن تھا اس لیے سب کو ماننا پڑا۔ اوراں جن کے چہرے سے کبھی مسکراہٹ مٹتی نہیں تھی، ہتھکڑی پہنتے وقت ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

مجسٹریٹ نے جو وعدہ کیا تھا اس سے وہ پھر گیا۔ پولیس افسروں کی آنکھوں میں فتح اور خوشی کی چمک آگئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے ہمیں نیچا دکھا دیا۔ ہم وہ سر جھکائے بیٹھے تھے شرم اور ذلت سے ان کی آنکھیں نیچی تھیں۔

کھانے کا جب وقفہ ہوا تو ہمارا ایک ہاتھ کھول دیا گیا اور ہم نے طے کیا کہ اب ہتھکڑی نہیں پہنانے دیں گے۔ اس کے بعد عدالت میں ایسا منظر پیش آیا کہ اس کی مثال شاید ہی کسی عدالت میں ملتی ہو۔ ہمارے ایک ہاتھ میں ہتھکڑی تھی اور اس کے بازو۔

۵۰ مسلح پولیس کے سپاہیوں اور افسروں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہمارے سروں پر لاٹھیاں
برسائیں اور جب ہم نیچے گر پڑے تو جوتوں سے ٹھوکریں لگائیں وہ ہمیں گھسیٹتے ہوئے
حالت میں لائے اور اس طرح ڈال دیا جیسے سن کے بورے لاکر ڈالے جاتے ہیں۔ بش
جن کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی وہیں بے ہوش ہو گئے بعض کے خون نکل رہا تھا
اور اکثر کے سارے جسم پر چوٹیں آئی تھیں۔

جتنے دیو چونکہ سب سے قوی تھے اس لئے ان پر توجہ بھی سب سے زیادہ کی گئی
تھی۔ انھیں کئی آدمیوں نے پکڑ لیا اور بہت پیٹا۔ ان کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی بعد از
میں آکر انھوں نے بڑی زوردار تقریر کی جس میں مجسٹریٹ اور حکومت کو خوب باتیں
سنائیں اور جو لوگ وہاں موجود تھے ان کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ گواہ رہیں کہ ہمارے
ساتھ کس قسم کا وحشیانہ سلوک کیا جاتا ہے۔

دوسرے دن ہتکڑی پہنانے کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔

بے دیو کے خلاف کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکا لیکن حکومت کے لئے
اس قدر کافی تھا کہ وہ "بم فیکٹری" میں موجود تھے اور انھیں کالے پانی کی سزا دے دی گئی
ان کی جیل کی ساری زندگی کشمکش سے بھری ہوئی رہی ہے۔ راج مندر
جیل میں انھوں نے ساڑھے پانچ مہینے بھوک ہڑتال کی پنڈت مالویہ اور دوسرے
لیڈروں کی مداخلت پر انھوں نے ہڑتال ترک کی۔ ایک مرتبہ انھیں کوڑے
بھی لگائے گئے۔

انڈمان کی ہر کشمکش میں بجے دیو نے نمایاں حصہ لیا۔ وہیں وہ کمیونسٹ
میں آگئے اور جیل کے اندر اس کے آرگنائزر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ تک اس کے سکریٹری
بھی رہے اور جیل سے پارٹی کا جو انگریزی اخبار "کال" نکلتا تھا اس کے کچھ دن
ایڈیٹر بھی رہے۔ یہ ہندی کے بہت اچھے ادیب ہیں، بہت اچھے مقرر ہیں اور انھوں

رکسزم کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اور جبکہ وہ رہا ہو گئے ہیں ملک کی آزادی کی آخری
ئی میں وہ نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔

انھوں نے سولہ سال سے زیادہ جیل میں گذارے۔ سخت مصائب سے انھیں
رنا پڑا کئی مرتبہ بھوک ہڑتال کرنی پڑی کئی بار پولیس کی لاٹھیاں کھانی پڑیں۔
ن یہ سب چیزیں نہ توان کی ہمت توڑ سکیں اور نہ ان کی جسمانی طاقت عمر کے ساتھ
میں سنجیدگی اور گہرائی آگئی ہے۔ مگر جس جذبہ نے انھیں ۱۴ سال کی عمر میں آزادی
جنگ میں دھکیل دیا تھا وہی جذبہ آج بھی ان میں موجود ہے۔

ڈاکٹر گیا پرشاد

ہندوستان سوشلسٹ ریپلکن ایسوسی ایشن کے اکثر رکن اسکولوں کے
ب علم تھے۔ لیکن ڈاکٹر گیا پرشاد تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ ڈاکٹری کرتے تھے
پریکٹس اچھی چلتی تھی۔ ان کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ ۲۲-۱۹۲۱ء کی سول نافرمانی
تحریک میں انھوں نے غیر معمولی حصہ لیا تھا۔ اس تحریک کی ناکامی اور اس کی
سے ملک میں جو بے بسی کا ایک جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے انھیں اس پر سوچنے
ور کیا۔ ان کے بہت سارے ساتھی اپنے دھندوں میں لگ گئے۔
وہ یہ نہ کر سکے بلکہ انقلابی دہشت پسندی کی تحریک میں شریک ہو گئے۔

اس زمانے میں ان کی اچھی خاصی گھنی داڑھی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی
ے زیادہ لگتے تھے اور معزز معلوم ہوتے تھے۔ ایک معمولی آدمی کے لئے بڑا
ل تھا کہ اس قدر سنجیدہ آدمی جو عینک لگانے کے بعد ادھیڑ عمر کا لگتا تھا اور
قدر متانت کے ساتھ اپنے مریضوں کا معائنہ کرتا تھا ایسی پارٹی کا سرگرم
ہو سکتا تھا۔ جو بم اور ریوالور کی مدد سے برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتی
یا پرشاد کی داڑھی اور ان کی داڑھی کی قابلیت نازک وقتوں پر بڑا کام

کر جاتی تھیں۔ جب بھی ضرورت ہوتی وہ اپنا چھوٹا سا مطب قائم کر لیتے اور یہ مطب گویا پارٹی کے مرکز کا کام دیتا۔

وہ پنجاب اور یوپی میں کام کرتے رہے اور سہارن پور میں شیو اور جے دیو کے ساتھ گرفتار ہوئے ہیں جب ان سے جیل میں دوبارہ ملا تو ان کی داڑھی غائب تھی مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت اور صدمہ ہوا اگرچہ وہ اچھے بدن کے تھے لیکن مضبوط نہیں تھے اس لئے جب بھی پولیس وغیرہ سے ٹکر ہوتی۔ انھیں کافی چوٹ آتی لیکن وہ کبھی ہمت نہ ہارتے تھے۔

ہم سب بے راہ رو کھلنڈروں کے لئے گویا وہ ماں کا کام کرتے تھے انھیں خانہ بدوشوں کی سی زندگی اور لاپروائی سے سخت چڑ تھی۔ وہ اپنے پلنگ کی چادر ہر تیسرے روز بدلتے تھے۔ اپنے کپڑے خود دھوتے تھے۔ ہمیشہ صاف ستھرے رہتے اور اپنی کتابیں اور دوسری چیزیں نہایت قرینے سے رکھتے اور صرف اسی حد تک نہیں بلکہ ہر ایک سے صاف ستھرا رہنے پر اصرار کرتے اور بعض وقت ہمیں شرمندہ کرنے کے لئے خود ہماری چیزیں ٹھیک ٹھاک کر جاتے ہیں، میں چونکہ سب سے زیادہ نافرمان اور لاپرواہ تھا اس لئے مجھ پر ان کی توجہ سب سے زیادہ تھی۔ میں انھیں آتا دیکھتا تو فوراً بھاگ جاتا۔ واپس آنے میں اکثر دیکھتا تھا کہ وہ میری چادر بدل دیتے اور میری چیزیں ٹھیک کر دیتے۔

چونکہ وہ با اصول تھے اور ہر کام بڑے سلیقہ سے کرتے تھے اس لئے ہمیں ان کا ایسا مینیجر کبھی نہیں ملا۔ وہ پورے باورچی خانے پر نگرانی رکھتے۔ کھانا پکانے والوں سے سلیقہ سے کام لیتے اور پھر اپنی نگرانی میں کھانا پکواتے۔ ان کا موڈ سے تو میری روح فنا ہوتی تھی لیکن وہ اس میں بڑی دلچسپی اور حقیقی خوشی محسوس کرتے تھے۔ جب وہ ہمارے مینیجر تھے ہمیں طرح طرح کے کھانے خود

پکا کر کھلایا کرتے تھے اور ہم بھی اس سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے اور خوب کھانے کے بعد ہم کہتے "ڈاکٹر صاحب آج تو آپنے کمال کر دیا، تو ان کا چہرہ خوشی سے کھل جاتا۔

جیل کے ڈاکٹر بھی جو ایسے برے نہیں تھے، گیا پرشاد کو بے حد پسند کرتے تھے۔ اگر ہم میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو انتہائی محبت سے اس کی تیمارداری کرتے جیل کے ڈاکٹروں سے مشورہ کرتے اور جب تک ضروری دوائیں حاصل نہ کر لیتے کسی کو چین نہ لینے دیتے اور پھر سب سے مشکل کام جو وہ کرواتے تھے وہ یہ کہ مریض کو وقت پر دوا پلواتے۔ خواہ مریض بھول جائے مگر وہ نہیں بھولتے تھے وہ ہماری منیجر، ڈاکٹر، نرس، سب ہی کچھ تھے۔

وکیل سرکار ایک ثبوت بھی اس کا نہیں پیش کر سکے کہ گیا پرشاد کسی مسلح کارروائی میں شریک تھے لیکن حکومت کے لئے اتنا کافی تھا کہ وہ ایسی پارٹی میں شریک تھے جو حکومت کے خلاف بغاوت کرتی تھی اور وہ ایک بم فیکٹری میں گرفتار رہتے تھے انھیں بھی کالے پانی کی سزا ملی تھی اور دوسروں کی طرح انھیں بھی سی کلاس میں رکھا گیا۔

وہ بھوک ہڑتال کی اور دوسری تمام جدوجہد میں شریک رہے۔ انڈمان میں گہرے مطالعہ اور غور کے بعد وہ کمیونسٹ بن گئے اور اس کے بعد ان کا عقیدہ اس پر بڑھتا گیا۔

۱۴ سال تک موت کے غاروں میں گزارنے سے ان کی صحت تباہ ہو گئی۔ جیل میں دق ہو گئی اور ایک سال سے حالت خراب تھی لیکن پنجاب کی حکومت جس کے وہ قید تھے معمولی انسانیت بھی برتنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے انھیں قید سے نہیں چھوڑا اب جا کر وہ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ رہا ہوتے ہیں۔

○

میں کمیونسٹ پارٹی میں کس طرح شریک ہوا؟

فروری سنہ ۱۹۳۱ء میں آزاد کی موت سے ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن اسوسی ایشن کو اتنا بڑا دھکا لگا کہ وہ اس سے جانبر نہ ہو سکی۔ حکومت کی سختی اور مظالم کی وجہ سے یہ پارٹی ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کی چند بنیادی وجوہات تھیں۔

آزاد کی شخصیت میں لوگوں کو اتنا اعتماد اور اتنا بھروسہ تھا کہ باوجود کامیا اور اندرونی نفاق کے پارٹی ٹوٹنے نہیں پائی۔ ان کے مرنے بعد مایوسی بہت بڑھنے لگی۔ کیلاش پاٹھے جیسے سرگرم لیڈروں کے دھوکہ سے پارٹی کے کارکنوں کو بہت دھکا پہنچا۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ آزاد کی موت بھی اس لئے ہوئی کہ ایک دوسرے مشہور ساتھی نے دھوکہ دیا تھا۔ کسی کو کسی پر بھروسہ نہیں رہا۔ ہر شخص دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتا۔ ہر شخص ایک دوسرے پر الزام رکھتا وہ اس سے فضا اور خراب ہونے لگی۔ پولیس کے ایجنٹ جو پارٹی میں گھس آئے تھے۔ انھوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ پھر بعض خود غرضوں نے پیسے ادھر ادھر کر دیئے۔ بعض نے ذاتی اغراض کے لئے ڈاکے ڈالے۔ اخلاقی حالت بہت گر گئی۔

ان حالات سے بد دل ہو کر اکشے نے سیاست سے کنارہ کشی کر لی۔ انھیں نہ دہشت پسندی میں اعتماد رہا، نہ اپنے ساتھیوں میں نہ اپنی ذات میں اور نہ ہی ملک کی آزادی میں۔ وہ اب کہنے لگے کہ اس ملک میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ ڈرپوک لوگوں اور غداروں کا ملک ہے۔ پولیس نے آہستہ آہستہ سب ساروں کو گرفتار کر لیا اور بڑی بڑی سزائیں دیں۔ جو اس سے بچ رہے انھوں نے ہر چیز سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

آزاد اور بھگت سنگھ نے جس پارٹی کو اپنی بے غرض قربانیوں اور اپنے خون سے سینچ کر پروان چڑھایا تھا آج اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں کی تاب نہ لا سکنے کی وجہ سے ختم ہو رہی تھی۔ یہ حقیقت ہمارے سامنے پوری طرح سے واضح ہو رہی تھی کہ درمیانی طبقہ کے نوجوانوں پر مشتمل انقلابی جماعت لوگوں سے علیحدہ رہ کر محض اپنی انفرادی جد و جہد سے ملک کو بیدار اور متحرک نہیں کر سکتی اور اس پارٹی کے اندرونی اتحاد اور جذبہ کا انحصار لیڈروں کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں نے ہمیں خیالی دنیا سے نکال دیا۔

مجھے اب تک دہشت پسندی پر جو عقیدہ تھا وہ ان واقعات کے بعد بالکل جاتا رہا لیکن سوال یہ تھا کہ اس کا بدل کیا ہے۔

گاندھی اروِن سمجھوتے کے بعد

اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ کانگرس نے اعتدال پسندی کا اور دستوری طریقہ ختم کر دیا ہے اور اب اس کے لیڈر انقلاب کے راستہ پر ملک کو لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن گاندھی اروِن سمجھوتے نے تمام امیدیں خاک میں ملا دیں کوئی شخص بھی اسے ملک کی فتح نہیں کہہ سکتا تھا اور خاص طور سے اس کے بعد جو واقعات پیش آئے۔ مثلاً باوجود سارے ملک کے

مطالبے کے بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی وغیرہ۔ انھوں نے شبہات اور بڑھا دیے۔ ہر طرف بے بسی اور جمود کا دور دورہ تھا۔ چند ماہ کے پہلے کے شولا پور، پشاور اور چٹاگانگ کے واقعات جنھوں نے سارے ملک میں بجلی دوڑا دی تھی۔ آج بھولے بسرے واقعات معلوم ہوتے تھے۔

جو کانگریسی تھا وہ اس سمجھوتے کی مذمت کرتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اسے کبھی منظور نہ کرے گی۔ میں کراچی اس اُمید میں گیا تھا کہ یا تو اس معاہدے کو مسترد کر دیا جائے گا۔ یا کم از کم بہت بڑی تعداد اس کے خلاف آواز بلند کرے گی۔ وہاں سبھاش بوس سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنی پوری قوت سے اس کی مخالفت کریں گے۔ انھوں نے ترقی پسند کانگریسیوں کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہمارے اور برطانوی حکومت کے درمیان خون کے سمندر اور لاشوں کے پہاڑ حائل ہیں ہمیں کوئی قوت گاندھی اروِن سمجھوتے کی منظوری دینے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

جب کانگریس کا اجلاس شروع ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ سبجکٹ کمیٹی کے جلسہ میں انھوں نے اس سمجھوتہ پر اعتراض تو ضرور کیا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ اس کے خلاف ووٹ نہیں دیں گے۔ کھلے اجلاس میں سوائے اس کے کہ چند ممبر غیر حاضر ہو گئے تھے اور صرف سردیسائی اور چند دوسرے ممبروں نے مخالفت کی تھی۔ اصل قرارداد بلا کسی خاص مخالفت کے منظور ہو گئی مجھے اب پوری طرح سے ادھر سے بھی ناامیدی ہو گئی۔ اگر دہشت پسندی آزادی کا راستہ نہیں تھی تو ہماری قوم پرستی و قوم پرستوں کے بائیں بازو کی پالیسی بھی ہمیں آزادی کی منزل تک نہیں لے جاتی تھی۔ میں سردیسائی سے یہیں کراچی میں پہلی مرتبہ ملا۔ اس ملاقات کے بعد جو ان سے گفتگو ہوئی تو اس کے بعد میں نے دہشت پسندی سے

ہمیشہ کے لئے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔

سردیسائی پہلے کمیونسٹ تھے جنہیں میں نے اتنے قریب سے جانا تھا۔ اب تک میں بہت سارے سیاسی کارکنوں سے ملا تھا مگر سوائے اپنی انقلابی پارٹی کے میں نے کسی کو بھی صحیح معنوں میں انقلابی نہیں پایا جو ایک مقصد کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے۔ سردیسائی کے صرف خیالات ہی نے نہیں بلکہ اس کی شخصیت نے بھی مجھے اپنی طرف کھینچا۔

ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن پارٹی کے دوسرے ممبروں کی طرح میری منزل مقصود بھی سوشلزم تھی۔ لاہور سازش کے سلسلہ میں گرفتار ہونے سے قبل میں کچھ عرصہ تک کانپور میں مزدور تحریک میں بھی کام کر چکا تھا۔ ہڑتالوں کے زمانے میں مزدور جس جوش اور انقلابی جذبہ کا اظہار کرتے تھے میں اس سے بہت متاثر ہوتا تھا لیکن ان کے لیڈر ہری ناتھ شاستری اور گوپی ناتھ کا مجھ پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا وہ کسی طرح بھی انقلابی نہیں کہلا سکتے تھے۔ اس لئے میں یہ سمجھتا تھا کہ جس تحریک کے لیڈر ایسے ہوں وہ تحریک انقلابی کیسے ہو سکتی ہے۔ اسے میں کانگرسی تحریک کا ایک جزو سمجھتا تھا۔

سردیسائی کو میں نے ویسا ہی پایا جیسا کہ میرا انقلابی کا ایک تصور تھا۔ ہماری جو گفتگو کراچی میں ہوئی وہ سرسری تھی اس لئے کہ وہاں کانگرس کی ان ہنگامہ خیزیوں میں تفصیلی گفتگو کرنا ممکن نہیں تھا لیکن ان باتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

جو خیالات میرے دل میں پہلے سے آ رہے تھے وہ مضبوط ہونے لگے اور اب یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ مٹھی بھر انقلابی نہ انقلاب لا سکتے ہیں اور نہ ملک کو بیدار اور متحرک کر سکتے ہیں۔ انقلاب ہی سے سامراجی حکمرانوں کا تختہ الٹا جا سکتا تھا اور

اس کے لئے صبر کے ساتھ اصولی طریقہ پر کام کرنے کی ضرورت تھی تاکہ محنت کشوں کو انقلابی طریقوں سے ان کے روزمرہ کے مطالبات کی بنیاد پر منظم کیا جائے اور انھیں آخری لڑائی کے لئے تیار کیا جائے۔

صنعتی مزدور قومی تحریک میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے کہ وہ ریلوں جہاز ڈاک اور اہم کارخانوں میں کام کرتے ہیں اور جد وجہد میں بہت اہم حصہ لے سکتے ہیں۔ محنت کشوں کا اندازہ ان لوگوں سے لگانا جو وقتی طور پر ان کی تنظیم پر حاوی ہیں غلط ہے۔ محنت کش کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ اس کا اظہار وہ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ اور دوسری بہت ساری جد وجہد میں کر چکے ہیں۔ اس وقت کا سب سے اہم کام یہی ہے کہ مزدوروں کو ان کے اعتدال پسند لیڈروں سے بچایا جائے۔ ان میں انقلابی بیداری پیدا کی جائے اور یہ احساس پیدا کیا جائے کہ ملک کو آزاد کروانے میں وہ کیا حصہ لے سکتے ہیں۔

پارٹی میں شرکت

کراچی سے واپس آنے کے بعد میں کانپور کی مزدور سبھا میں کام کرنے لگا ساتھ ہی اس زمانے میں مجھے جو کتابیں مل جاتیں وہ بھی پڑھتا رہتا۔ چند مہینے تک رائے سے بھی میرا رابطہ رہا اس لئے کہ مجھے کمیونزم اور رائے کی پالیسی میں فرق معلوم نہیں تھا اور رائے کو میں کمیونسٹ سمجھا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں چل کر جب میں حقیقت سے واقف ہوا تو پھر رائے سے تعلق منقطع کر لیا۔

۱۹۳۱ء میں مجھے فرضی الزامات پر پھر گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بعد ڈیڑھ سال جو میرے جیل میں گذرے۔ وہ میں نے مطالعہ میں صرف کئے۔ اسی زمانہ میں ایک اور اتفاقی بات پیش آئی۔ سردیسائی جو اسی زمانہ میں گرفتار ہوئے تھے کچھ ہفتہ کے لئے میرے ہی بیرک میں رکھے گئے۔ ان سے بحث مباحثہ اور گفتگو کے بعد میرے

خیالات اور صاف ہو گئے اور ۱۹۳۳ء میں میں جب رہا ہو کر نکلا تو پوری طرح کمیونسٹ بن چکا تھا۔

اس کو بارہ سال گذر گئے ہیں۔ اس عرصہ میں ہندوستان میں اور ساری دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔ وہ پارٹی جس میں میں ۱۹۳۳ء میں شریک ہوا تھا ۱۲ سال سے ایک چھوٹے سے گروہ سے بہت بڑی سیاسی قوت بن گئی ہے جس کی جڑیں مزدوروں اور کسانوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ نہ اسے ظلم و ستم ختم کر سکے اور نہ مخالفوں کی بدزبانی اور جھوٹا پروپگنڈہ اس کی ترقی کو روک سکا۔

اس پارٹی میں آج بے شمار نوجوان شریک ہیں جن میں سے اکثر سادہ دل مزدور اور کسان ہیں۔ ان میں انگریز سامراجیوں سے اتنی ہی نفرت اور اپنے ملک سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ بھگت سنگھ اور ان کے بہترین ساتھیوں میں تھی یہ بھی اسی طرح بے غرضی سے آزادی کی منزل تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے ساتھی ہونے پر ہر شخص فخر کرے گا۔ جن کے ساتھ کام کرنے میں ہر شخص خوشی اور عزت محسوس کرے گا۔

پرانے ساتھیوں سے ملاقات

گزشتہ سالوں میں میں سوچا کرتا تھا کہ میرے پرانے ساتھی انڈمان میں کیا کرتے ہوں گے۔ اس امتحان کا کس طرح مقابلہ کر رہے ہوں گے ان کا ذہن کس طرح پر کام کرتا ہوگا۔ کبھی کبھی جو خبریں آتیں تو ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے آزاد اور بھگت سنگھ کی روایتوں کو برقرار رکھا ہے۔ سامراجی مظالم کے سامنے کبھی اپنا سر جھکنے نہیں دیا۔ مارپیٹ اور جسمانی تکلیفیں انھیں زیر نہ کر سکیں اور ان کے ایک ساتھی مہابیر سنگھ نے اپنی جان دے کر انڈمان کے دوسرے قیدیوں کے لئے حقوق حاصل کئے تاکہ وہ انسانوں کی طرح زندگی گذار سکیں۔ میں ان سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن حکومت نے مجھے کبھی اس کا موقع نہیں دیا۔ حتیٰ کہ میں نے جو خط لکھے تھے۔ وہ تک انھیں نہیں پہنچائے گئے۔

۱۹۳۸ء میں ہمیں خبر ملی کہ ان میں سے سب کے سب کمیونسٹ ہو گئے ہیں اور میرے ان ساتھیوں ہی نے انڈمان میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم قائم کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ میرا دل مسرت اور فخر سے کھل گیا۔ سالہا سال پہلے جو اشتراکی خیالات ہمارے دلوں میں بیج تھے آج وہ بار آور ہو رہے تھے۔

۱۹۴۰ء میں اپنی گرفتاری کے بعد میں جئے دیو، شیو ورما اور گیا پرشاد سے لکھنؤ جیل میں ملا۔ اب وہ پورے اور پکے کمیونسٹ تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع

اور آبرا تھا اور وہ سب اس دن کے انتظار میں تھے جبکہ رہا ہو کر اس تحریک کی وہ بھی کچھ خدمت کر سکیں گے۔ ان کا جوش اور ان کی ہمت اسی طرح جوان تھی انہیں اسی طرح اپنے آپ اور عوام پر بھروسہ تھا اگرچہ انہیں معلوم تھا کہ ابھی جیل کی گھڑیاں کافی طویل ہیں۔

ہم نے پرانی یادیں تازہ کیں۔ انڈمان کی دل ہلا دینے والی جدوجہد کی تفصیل ان سے سنی اور انھوں نے مجھ سے بڑھتی ہوئی کمیونسٹ تحریک کے متعلق باتیں پوچھیں۔ چند ہفتہ بعد مجھے دوسرے جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ بس یہ آخری بار تھی جب میں ان سے ملا تھا۔ بعد میں لاہور جیل میں چند منٹ کے لئے کشوری سے بھی ملنے کا موقع ملا تھا۔

ان لوگوں کو پارٹی سے بے حد محبت اور عقیدت رہی ہے اس لئے وہ جیل میں نہ صرف مارکسزم کا مطالعہ کرتے رہے بلکہ پارٹی کی سرگرمیوں سے بھی اپنے کو باخبر رکھا وہ جس جیل میں جاتے ہمیشہ دوسرے ساتھی قیدیوں پر بہت اچھا اثر ڈالتے اور انھیں بتلاتے کہ آزادی حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ کمیونسٹ پارٹی کا راستہ ہے۔ ان کے آزادی کے جذبہ اور کمیونسٹ پارٹی سے محبت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ جب جاپانیوں کے حملہ کا خطرہ بڑھا تو باوجودیکہ انھیں معلوم تھا کہ ان کے رہا ہونے کے امکانات بہت کم ہیں اور اگر جاپانی حملہ کامیاب ہو گیا تو ان کا کیا حشر ہوگا انھوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ آخری قطرہ خون تک مادر وطن کی حفاظت کریں۔ آزاد اور بھگت سنگھ کے ان ساتھیوں نے دہشت پسند تحریک کی اعلیٰ ترین روایات کو برقرار رکھا۔ وہ ہمیشہ صحیح معنوں میں انقلابی رہے۔ کوئی قوت اور کوئی خطرہ انھیں خوف زدہ نہ کر سکا۔ جس بات کو انھوں نے سچ سمجھا اس کا ببانگ دہل اعلان کیا خواہ اس کے متعلق عام جذبہ کچھ ہی رہا ہو۔

غداروں کی پارٹی؟

ہمارے محبانِ وطن کی آنکھوں میں فرقہ بندی اور تعصب نے اتنی گہری چادر چڑھا دی ہے کہ اس کا جواب نہیں ملتا۔ کچھ دن پہلے میں جب پنجاب میں تھا تو میں دیکھتا تھا کہ سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لئے کانگرس کی طرف سے جو جلسے ہوتے تھے ان میں کشوری۔ جتے دیو، شیو اور گیا پرشاد کا نام کبھی نہیں لیا جاتا تھا باوجودیکہ یہ لوگ سولہ سال جیل میں کاٹ چکے تھے۔ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ آج ہنس راج دہرہ جس نے اپنی جان بچانے کے لئے بھگت سنگھ اور کشوری کے خلاف بیان دیا تھا۔ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے "تم کمیونسٹوں نے اگست کی تحریک میں دغا کی اور حکومت سے مل گئے۔" ایسا غدار غالباً کسی کو منہ نہ دکھا سکتا۔ لیکن آج وہ محب وطن بنا ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کس نوبت پر پہنچ گئے ہیں۔

جب یہی باتیں پنڈت نہرو اور دوسرے بزرگ رہنما دہراتے ہیں تو آدمی سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ یہ لوگ جنھوں نے اپنی زندگی کے بہترین دن ملک کی نذر کر دیئے۔ ڈاکٹر گیا پرشاد جنھیں دق ہو گئی لیکن جیل سے نکلنے کے لئے حکومت کا سہارا لینے کا جنھیں کبھی خیال نہیں آیا۔ شیو ورما جو بھوک ہڑتال کے زمانے میں نمونیا کی تکلیف سے بستر پر لوٹتے تھے لیکن جنھوں نے دوا تک استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ جتے دیو جن پر بار بار ہنٹر پڑے اس لئے کہ وہ سیاسی قیدیوں کے وقار کے لئے لڑتے تھے۔ کشوری جنھیں ہفتوں ہزاروں قسم کی جسمانی تکلیفیں دی گئیں اور پولیس ایک لفظ پارٹی کے متعلق نہ کہلوا سکی۔ کیا یہ لوگ ملک کے غدار ہیں؟ کیا ایسے لوگ کسی ایسی پارٹی کے رکن ہو سکتے ہیں یا اس سے اتنی عقیدت رکھ سکتے ہیں جو ملک سے غداری کرے؟ پنڈت جی کو یہ کہتے وقت ذرا اس پر غور کرنا چاہیئے۔

○